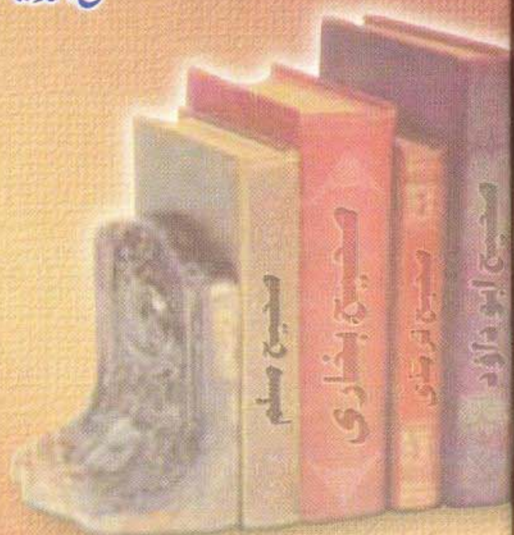
حجیتِ حدیث

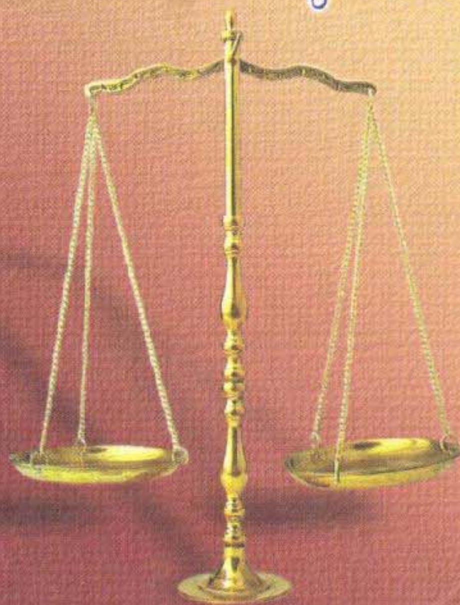
تالیف

شیخ الحدیث مولانا محمد اسمٰعیل السلفی رحمہ اللہ

تخریج

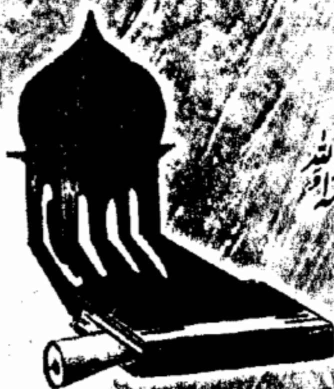
محمد سرور عاصم





مکتبہ اسلامیہ

حجیتِ حدیث



تالیف

شیخ الحدیث مولانا محمد اسمٰعیل السلفی رحمہ اللہ

تخریج

محمد سرور عاصم





مکتبہ اسلامیہ

کتاب .... حجیتِ حدیث

تالیف .... شیخ الحدیث مولانا محمد اسمٰعیل السلفی رحمہ اللہ

تخریج .... محمد سرور عاصم

کمپوزنگ / ڈیزائننگ .... مکتبہ اسلامیہ پرنٹرز

اشاعت .... اپریل 2006ء

قیمت ....

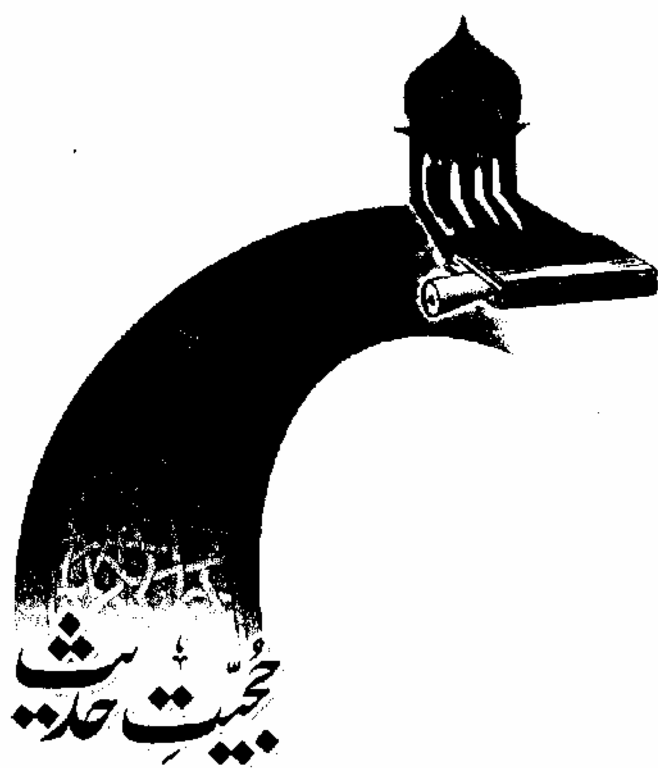




مکتبہ اسلامیہ

لاہور | بالمقابل رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار فون : 042-7244973

فیصل آباد | بیرون امین پور بازار کوتوالی روڈ فون : 041-2631204


حجیتِ حدیث

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مَا یَجِبُ اِسْتِحْضَارُهٗ اَوَّلًا

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى. حدیث کے خلاف جس قدر لٹریچر شائع ہو رہا ہے اور جس عجلت سے شائع ہو رہا ہے اور جس لب ولہجہ سے شائع کیا جا رہا ہے' وہ اصحابِ سنت سے مخفی نہیں اور اس کے متعلق جس قدر ذمہ داری ان لوگوں پر عائد ہوتی ہے جو قرآن اور سنت کو تاویل اور تقلید کے بغیر مانتے ہیں وہ بھی اربابِ سنت والحدیث پر عیاں ہے اور اس میں جس قدر تساہل برتا جا رہا ہے وہ بھی پوشیدہ نہیں۔ زندہ جماعتوں کے لیے اس قسم کا اغماز اور تساہل جس قدر مضر ہے اس سے بھی آپ حضرات بے خبر نہیں۔ پیش نظر مقالہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ دراصل یہ ایک تقریر تھی جو جامعہ سلفیہ کانفرنس فیصل آباد میں کی گئی تھیں جس میں اختصار کے ساتھ انکارِ حدیث کے اس پہلو پر کچھ گزارشات پیش کی گئی تھیں بعد میں احباب کے اصرار پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ الاعتصام میں شائع ہوئیں جسے ضلع ملتان کے کسی صاحب نے شائع کر دیا ہے۔ یہ اشاعت گو میری اجازت سے تھی مگر وہ اس قدر غلط اور خراب چھپی کہ اسے دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ کاش! وہ حضرت اسے اس طرح شائع کرنے کی تکلیف نہ فرماتے۔ لہٰذا اس پر مزید ایک نظر ڈال کر یہ مقالہ شائع کیا جا رہا ہے۔ ان ہی ایام میں جسٹس محمد شفیع صاحب جج ہائیکورٹ کا ایک فیصلہ بھی نظر سے گزرا' جو بے حد غیر معتدل اور ایسے بڑے آدمی کے علمی مقام سے بہت پست تھا۔ میں چونکہ انگریزی نہیں جانتا اس لیے اردو تراجم پر اعتماد کر کے اس کی بعض خامیوں کو واضح کیا گیا۔ اگر یہ کوشش عنداللہ مقبول ہو تو میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس اجر میں میرے اساتذۂ کرام کو بھی شریک فرمائے۔

والسلام

محمد اسمٰعیل

چاہ شاہاں گوجرانوالہ

۲/۹/۶۳

حدیث کی تشریعی اہمیت

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْخَلْقِ اَجْمَعِيْنَ مُحَمَّدٍ خَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ وَعَلٰى اَصْحَابِهٖ وَاٰلِهٖ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ مِنْ فُقَهَاءِ الْمُحَدِّثِيْنَ وَمَنْ حَذَاحَذْوَهُمْ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ. اَمَّا بَعْدُ! فَهٰذِهٖ وُرَيْقَاتٌ تَشْتَمِلُ عَلٰى مُحَاضَرَةٍ اَلْقَيْتُهَا فِي الْحَفْلَةِ السَّنَوِيَّةِ لِجَمْعِيَّةِ اَهْلِ الْحَدِيْثِ بِفَيْصَلْ آبَادَ نَنْشُرُهَا بَعْدَ تَهْذِيْبِهَا وَتَنْقِيْحِهَا عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَنْفَعَ بِهٖ طُلَّابَ الْعِلْمِ وَالْحَقِّ الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ بِهٖ مُحَمَّدًا ﷺ وَيَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَاءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ.))

ادلۂ شرعیہ کے تذکرہ میں قرآنِ عزیز کے بعد ائمہ سنت علی العموم علومِ نبوت کے متعلق چار لفظ ذکر فرماتے ہیں۔

① خبر ② اثر ③ حدیث ④ سنت

عاملین بالحدیث جو کتاب اللہ کے بعد حدیث کی حجیت پر یقین رکھتے اور اسے حجتِ شرعی سمجھتے ہیں وہ دین کی کتابوں میں مختلف نسبتوں سے مشہور ہیں۔

- اہلِ سنت • اہلِ حدیث • اہل الاثر

خبر

کسی واقعہ کی اطلاع اور اس کی حکایت کو کہا جاتا ہے اَلْخُبر اور خُبار نرم زمین اور غبار کو بھی کہا جاتا ہے۔ اَلْخُبْرُ اَلْاَرْضُ الرَّخْوَةُ السَّهْلَةُ. ثلث ربع پر زمین کی کاشت کے معاملہ کو مخابرہ کہتے ہیں۔

زبان کے لحاظ سے تو واقعہ کی ہر اطلاع اور تذکرہ کو ''خبر'' کہا جاتا ہے۔ مگر آنحضرت ﷺ کے ارشادات پر جب یہ لفظ بولا جائے تو حدیث کے مترادف ہوگا یعنی اخبار الرسول کے ہم معنی ہوگا۔

اثر

کسی چیز کے بقیہ اور نشان کو کہتے ہیں ﴿فَانْظُرْ اِلٰی اٰثَارِ رَحْمَةِ اللّٰهِ﴾ ❶ نقل کو اثر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْ فِیْهِ تَمَارَیْتُمَا بَیْنَ السَّامِعِ وَالْاٰثِرِیْ

''جس بات میں تم بحث کررہے ہو وہ سننے والے اور ناقل کی نگاہ میں برابر ہے۔''

صحابہ اور تابعین سے جو مسائل منقول ہیں انہیں آثار کہا جاتا ہے۔

﴿اِیْتُوْنِیْ بِکِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَا اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ.﴾ ❷

''اس سے پہلے کوئی کتاب لاؤ یا کوئی علمی نقل۔''

آنحضرت ﷺ کے ارشادات پر بھی اثر کا لفظ بولا جاتا ہے اور عموماً اس کا استعمال اضافت سے ہوتا ہے۔ جب آثار الرسول کہا جائے تو یہ حدیث اور سنت کے مترادف ہوگا اور مطلقاً بولا جائے تو آثارِ صحابہ مراد ہوں گے یا اس کا لغوی مفہوم۔

حدیث

حدیث کا لفظ لغت میں قدیم کی ضد ہے۔ اس کا مصدر حدث ہے جس کا اطلاق نئے عوارض پر ہوتا ہے۔ رَجُلٌ حَدِثٌ کے معنی جوان آدمی ہے۔ انسان کے منہ میں دانتوں کی بندش کے اندر قدرت نے ایک ایسی مشین نصب فرمائی ہے جو غیر شعوری طور پر بلا تامل نئے سے نئے الفاظ بناتی چلی جاتی ہے۔ منہ کے خول میں ہوا کی حرکت اور حلق کی آخری حد تک ہوا کے تموج سے لاکھوں الفاظ منٹوں میں بن جاتے ہیں جن میں ایک سے ایک نیا اور جدا ہوتا ہے۔ دانتوں اور ہونٹوں کی رکاوٹ الفاظ کے بننے اور مخارج کی صحت میں مدد دیتی ہے۔

﴿ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ.﴾ ❸

انسان کے اور بھی بیسوں اعضاء ہیں لیکن الفاظ اور نطق کی مشینری صرف منہ میں نصب کی گئی ہے۔ معلوم نہیں دنیا کا سب سے پہلا انسان جب اس نے افہام و تفہیم کے لیے اس

❶ ۳۰/الروم: ۵۰۔ ❷ ۴۶/الاحقاف: ۴۔ ❸ ۳۶/یٰس: ۳۸۔

مشینری سے پہلے پہل کام لیا ہوگا تو وہ کتنا خوش ہوا ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی اس نعمت پر اس نے کتنے سجدے کیے ہوں گے۔ ﴿فَتَبَارَکَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ﴾ 1

اس گفتگو کو عربی زبان میں حدیث کہتے ہیں۔ اس کی جمع صحیح مذہب کے مطابق احادیث ہے۔ دنیا کے عجائبات اور خلاف امید واقعات کی حکایات اور قصوں کو بھی احادیث فرمایا گیا ہے: ﴿فَجَعَلْنَا هُمْ اَحَادِيْثَ﴾ 2

ہم نے حوادث کو کہانیوں کی صورت دے دی: ﴿مَا يَأْتِيْهِمْ مِنْ ذِكْرٍ مِنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ﴾ 3

راغب فرماتے ہیں: (اَلْحَدِيْثُ وُجُوْدُ الشَّيْءِ بَعْدَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ حَتّٰى اُحْدِثَ) 4 لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا تَاْوِيْلُ الْاَحَادِيْثِ 5 ﴿لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا﴾ 6 سب اسی قسم کے محاورات ہیں۔

آنحضرت ﷺ کے ارشادات کو اور قرآن عزیز کو بھی حدیث کا نام دیا گیا۔ ﴿وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا﴾ 7

"جب آنحضرت ﷺ نے اپنی بعض بیویوں سے آہستہ بات کی۔"

﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا﴾ 8 "اللہ تعالیٰ سے زیادہ کس کی حدیث سچی ہے۔"

سُنّت

سین اور نون مشددہ میں قوت، پختگی اور متوارث عادات کا مفہوم ہوتا ہے۔ سِنٌّ، سِنَانٌ، مَسْنُوْنٌ، سِنٌّ دانت کو کہتے ہیں۔ سِنَانٌ نیزے کے پھل کو کہا جاتا ہے۔ مَسْنُوْنٌ خشک کیچڑ پر بولا جاتا ہے۔ سُنَّةٌ ان تمام الفاظ کا ایک ہی ماخذ ہے۔ سِنٌّ لغت میں اس راستہ کو کہا جاتا ہے جس پر متواتر چلنے کی وجہ سے وہ صاف اور واضح ہو گیا ہو جسے طریق معبد سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ رائج عادات اور مستمر اعمال پر بھی سنت کا اطلاق متعارف ہے۔ اسی محاورہ کے مطابق طریقہ اور سیرت بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے۔ زبان کے لحاظ سے اچھی اور بری عادات

1 ٢٣/المؤمنون:١٤۔ 2 ٣٤/سبا:١٩۔ 3 ٢١/الانبیآء:٢۔
4 مفردات القرآن (اردو) مادہ ح دث۔ ٢١٨/١۔ 5 ١٢/یوسف:٦۔
6 ٤/النسآء:٧٨۔ 7 ٦٦/التحریم:٣۔ 8 ٤/النسآء:٨٧۔

دونوں پر سنت کا لفظ بولا جاتا ہے۔ ((مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ اَجْرُهَا وَاَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا وَمَنْ سَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً فَلَهُ اَجْرُهَا وَاَجْرُمَنْ عَمِلَ بِهَا)) [1] "میں سنت کا لفظ اسی لغوی لحاظ سے فرمایا ورنہ سنتِ نبوی کی صفت سَيِّئَةً کیسے ہوسکتی ہے۔ (فَاِنَّ السُّنَّةَ خَيْرٌ كُلُّهَا) بعض احادیث میں بعض اعمال کے متعلق بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے (نِعْمَتِ الْبِدْعَةُ هٰذِهِ) [2] کے الفاظ ارشاد فرمائے جس سے مراد بدعتِ لغوی ہے ورنہ مصطلحہ بدعت کے متعلق جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ((كُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ.)) [3] فرمائیں: تو ضلالت کو ضلالت حسنہ کون کہہ سکتا ہے؟

شارع کی زبان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل' خاموشی' اجتہادِ نبوی سب سنت میں داخل ہیں۔ معتزلہ نے انبیا علیہم السلام کے متعلق اجتہاد واستنباط کا انکار کیا ہے لیکن ائمہ سنت انبیا کے لیے اجتہاد کو جائز سمجھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی اصلاح نہ فرمائی جائے تو یہ بھی سنت میں شامل ہے۔

اصولِ فقہ کے متون میں بعض علما نے فرمایا: سنت کا لفظ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال پر بولا ہے اور حدیث کا لفظ اقوال پر لیکن ادلۂ شرعیہ کے تذکرہ میں وہ حدیث اور سنت کو مترادف اور ہم معنیٰ سمجھتے ہیں۔ سنت کا لفظ جب اضافت سے استعمال ہو تو سنتِ نبوی سے مراد احادیثِ نبوی ہی لی جاتی ہیں۔

سنت شرعی اصطلاح کے مطابق شرعی اور دینی احکام کے لیے ماخذ ہے یہ بھی ضروری نہیں کہ سنت بصراحت قرآن عزیز میں موجود ہو۔ شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

(اِعْلَمْ اَنَّهُ قَدِ اتَّفَقَ مَنْ يُعْتَدُّ بِهٖ مِنْ اَهْلِ الْعِلْمِ عَلٰى اَنَّ السُّنَّةَ الْمُطَهَّرَةَ مُسْتَقِلَّةٌ بِتَشْرِيْعِ الْاَحْكَامِ وَاَنَّهَا كَالْقُرْاٰنِ فِيْ تَحْلِيْلِ

[1] **مسلم**' كتاب العلم باب من سن سنة حسنة او سيئة...... رقم ۶۸۰۰؛ **نسائی**' كتاب الزكوٰة' باب التحريض على الصدقة' رقم۲۵۵۵؛ **احمد**' ۳۶۱/۴ والحميدی۔ رقم۸۰۵۔

[2] **الموطا**' كتاب الصلاة فی رمضان' باب ماجاء فی قيام رمضان' رقم۳؛ **بخاری**' كتاب صلاة التراويح' باب فضل من قام رمضان رقم ۲۰۱۰۔

[3] **ابو داؤد**' كتاب السنة'باب فی لزوم السنة' رقم۴۶۰۷؛ **مسلم**' كتاب الجمعة' باب تخفيف الصلوة والخطبة' رقم۲۰۰۵؛ **نسائی**'كتاب العيدين' باب كيف الخطبه'۱۵۷۹احمد:۳۷۱/۳۔

الْحَلَالِ وَتَحْرِيمِ الْحَرَامِ.) [1]

"سُنت احکام کے اثبات اور تشریح میں مستقل اصل ہے اور حلال وحرام کے احکام بالاستقلال سنت میں موجود ہیں۔"

سوچیے کہ اگر ایک حکم قرآن اور سنت میں بصراحت موجود ہو اور آپ اسے مان لیں تو آپ نے سنت پر کیا احسان کیا؟ وہ تو قرآن ہے! اس کا انکار کیسے ممکن تھا۔ ہاں یہ درست ہے کہ اگر کوئی حدیث یا سنت قرآن کے صراحۃً خلاف ہو تو وہاں قرآن ہی کی صراحت پر عمل ہو گا۔ گو یہ فی الواقع ناممکن ہے کہ پیغمبر علیہ السلام قرآن کی مخالفت کریں۔

موضوع بحث

ہمارے پیش نظر موضوع میں سنت اور حدیث مترادف ہیں اور شرعاً یہ دونوں حجت ہیں بلکہ جن احادیث کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ بھی دراصل افعال ہی ہیں کیوں کہ قول زبان کا فعل ہے اسی طرح تقریر اور اجتہاد یہ بھی دراصل فعل ہی ہیں اور سنت ان سب کو شامل ہے اور تکمیلِ دین کے لیے ان سب پر یقین اور ایمان لانا ضروری ہے ورنہ قرآن اور متواتر سنن اپنی کثرت کے باوجود زندگی کے تمام گوشوں پر حاوی نہیں ہو سکتے۔

مسلم الثبوت میں بھی سنت کی تعریف اس طرح کی گئی ہے۔(مَا صَدَرَ عَنِ الرَّسُوْلِ غَيْرَ الْقُرْآنِ مِنْ قَوْلٍ وَفِعْلٍ وَتَقْرِيْرٍ) [2]

ائمہ سنت کے نزدیک جو سنت حُجتِ شرعیہ شمار کی گئی ہے اور جسے احکام کا ماخذ سمجھا گیا وہ ضروری ہے کہ قرآن کے علاوہ ہو۔ اس کی تصریحات قرآنِ عزیز کی تصریحات سے مختلف ہوں گی لیکن مخالف نہیں ہوں گی۔

سُنت کی حیثیت

قرآنِ عزیز کے الفاظ جس تواتر اور قطعیت سے ہم تک پہنچے ہیں سنت کو وہ مقام

---

[1] ارشاد الفحول، ص ۳۱: المقصد الثانی، ۱/۱۸۷۔

[2] مسلم الثبوت، المقصد الثانی: ص ۱۷۵؛ شرح مختصر الروضہ، ۲/۶۰؛ الوجیز فی اصول الفقہ، الباب الثانی، الفصل الثانی، ص ۱۶۱؛ الابھاج فی شرح المنھاج للسبکی، ۲/۲۸۸ الکتاب الثانی فی السنہ۔

حاصل نہیں ہوا۔ سنت کا گو بہت بڑا ذخیرہ متواتر ہے لیکن تمام مروی متون کو قطعیت اور تواتر کا یہ شرف حاصل نہیں ہوا۔ عبادات اور اعمال کا کثیر سرمایہ متواتر ہے۔ نماز' اس کے فرائض' سنن اذکار تنوع کے باوجود بحیثیت مجموعی متواتر ہیں مگر معاملات' مغازی اور سیرت کا بہت سا ذخیرہ اخبار آحاد ہیں۔ علم الاسناد کے مباحث اور رجال میں جرح و تعدیل کی وجہ سے آحاد کے ذخیرہ میں وہ قطعیت نہیں رہتی۔ عبادات کے بھی بعض گوشے آحاد ہی کے مرہونِ منت ہیں لیکن ان آحاد کا مقام بھی اخباری روایات سے کہیں زیادہ ارفع ہے۔ محدثین کی تنقید اور نقل' اخبار اور تاریخ سے مختلف اور بہت زیادہ موثق ہے بلکہ علما نے صحیح اخبارِ آحاد کے قبول اور ان پر عمل کے وجوب پر اتفاق فرمایا۔ [1] ان سے جو علم حاصل ہوتا ہے گو وہ متواتر کے برابر نہیں ہوتا لیکن بذاتِ خود وہ قابلِ استناد ہے۔ تعارض کے وقت ہوسکتا ہے کہیں آحاد کو نظر انداز کیا جائے۔ ورنہ عام حالات میں تمام فقہا اور محدثین نے آحاد کو قبول فرمایا ہے۔ ان سے مسائل استنباط فرما کر آحاد کی ظنیت کو شکوک و اوہام کے مترادف نہیں گردانا جیسا کہ اکثر منکرینِ حدیث سمجھتے یا کہتے ہیں۔ ائمہ اسلام نے رائے اور قیاس پر اخبارِ آحاد کو ہمیشہ ترجیح دی ہے۔ اسی لیے اہلِ علم نے اجتماعی طور پر علم الحدیث کو تاریخ اور اخباری روایات سے بالکل الگ سمجھا ہے۔ ائمہ حدیث اور ائمہ تاریخ کا تعلق عام اور خاص کا سا ہے۔ یعنی ہر محدث اخباری ہوتا ہے لیکن ہر اخباری محدث نہیں ہوتا۔

بعض اہلِ علم دونوں فنون کے جامع ہیں۔ حافظ ابن جریر' حافظ ابن کثیر' امام بخاری' ذہبی رحمہم اللہ وغیرہ محدث بھی ہیں اور مؤرخ بھی لیکن مؤرخین میں مسلم اور غیر مسلم سب شامل ہیں اس لیے وہ محدث نہیں ہوسکتے۔

میرا مقصد یہ ہے کہ چونکہ حدیث کے پورے ذخیرہ کا ثبوت اس طرح متواتر نہیں جس طرح قرآنِ عزیز کا متواتر ہے۔ اسی لیے ائمہ سنت نے احادیث کو ادلۂ شرعیہ میں ثانوی حیثیت دی ہے لیکن ثبوتِ مسائل کے لحاظ سے بعض وقت نصوصِ حدیث' قرآن سے بھی مقدم ہوتے ہیں۔ مسئلہ حدیث سے ثابت ہوتا ہے اور امت اس پر عرصہ تک عمل کرتی رہتی ہے مگر قرآن میں اس کی تائید مدتوں بعد ہوتی ہے۔ مثلاً

---

[1] معالم اصول الفقه عند اهل السنة والجماعة' ص١٤٦؛ المسأله خبر الآحاد؛ ارشاد الفحول ١/٢٥٣ القسم الثانی الآحاد۔

① نماز آنحضرت ﷺ پر معراج کی رات فرض ہوئی۔اس کی تفصیلات یعنی اذکار، تعدادِ رکعات اسی وقت بذریعہ سنت واضح فرمائے گئے۔قرآن عزیز نے اس کے بعد اجمالاً ان کی تائید فرمائی اور یہ سلسلہ عرصہ تک چلتا رہا۔ [1]

② نماز کے لیے طہارت شرط تھی۔معراج کی صبح جبریل نے آنحضرت ﷺ کو طہارت کا طریق سکھایا۔پھر صحابہ رضی اللہ عنہم بالالتزام وضو کرتے اور نماز ادا فرماتے رہے۔لیکن سورۂ مائدہ واقعہ معراج سے تقریباً آٹھ سال بعد ۶ھ میں نازل ہوئی جس میں وضو اور اس کے فرائض بیان فرمائے گئے۔معلوم ہے کہ معراج کا سفر صحیح روایت کے مطابق ۱۲ھ نبوی میں ہوا۔ یعنی ہجرت سے قریب قریب دو سال پہلے۔

③ نماز جمعہ مدینہ منورہ میں آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری اور ہجرت سے پہلے ہی صحابہ رضی اللہ عنہم نے شروع کر دی تھی۔اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کی آمد سے پہلے مدینہ منورہ میں جمعہ پڑھاتے تھے۔ [2] سورۂ جمعہ جس سے فرضیت جمعہ پر استدلال کیا جاتا ہے۔صحیح روایات کے موافق سفرِ ہجرت میں مدینہ منورہ پہنچنے سے پہلے نازل ہوئی۔جمعہ پہلے شروع ہو چکا تھا۔سورۂ جمعہ میں اس کی تائید ہوئی۔سورۂ جمعہ کو مشہور روایت کے مطابق اس لیے مدنی مان لیا جائے کہ وہ مدینہ منورہ میں نازل ہوئی تو مسئلہ اور بھی واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن میں جمعہ کی فرضیت کا حکم اس وقت آیا جبکہ جمعہ مدینہ میں شروع ہو چکا تھا۔ [3]

④ موسیٰ علیہ السلام کو مدین سے واپسی پر نبوت عطا فرمائی گئی لیکن اس وقت تورات نہیں دی گئی۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون، ہامان اور اکابر قبط سے مقابلہ سنت کی بنا پر کیا، یہ سلسلۂ وحیِ غیر متلو ہی کی بنا پر چلتا رہا۔قرآن عزیز سے ظاہر ہے کہ توراۃ فرعون کی ہلاکت کے بعد تیہ کے جنگل کی

---

[1] **قرآن کریم تفسیر وبیان مع السباب النزول للسیوطی**، السباب نزول۶ من سورة المائده، ص۱۸٤؛ **الاتقان فی علوم القرآن**، النوع الثانی عشر،ماتأخر حکمه عن نزوله وما تأخرنزوله عن حکمه، ۱/۱٤٤۔

[2] **ابو داؤد**، کتاب الصلاة: باب الجمعة فی القریٰ، رقم۱۰٦۹؛ **ابن ماجه**، کتاب اقامة الصلاة: باب فی فرض الجمعه، رقم۱۰۸۲؛ **ابن خزیمة**، کتاب الجمعة باب ذکر اول جمعة جمعت بمدینة النبی ﷺ ۱۷۲٤؛ **ابن حبان**، کتاب اخباره عن مناقب الصحابه، باب ذکر البیان بان اسعد بن زراه جمع اول جمعة بمدینة، رقم۷۰۱۳؛ **المستدرک للحاکم**، کتاب الجمعه، ٤۱۷۸۔ ۱۰۳۹/۱٤۔

[3] **الاتقان**، النوع الثانی عشر، ۱/۱٤٤۔

اقامت کے ایام میں عنایت فرمائی گئی۔فرعون کی تباہی اور بربادی کا پہلا منظر سنت کی مخالفت ہی کی وجہ سے ہوا۔ چنانچہ سورۂ قصص میں فرعون عساکر کی تباہی کے بعد فرمایا:

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ﴾ [1]

''پہلے لوگوں کو ہلاک کرنے کے بعد ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی جس میں لوگوں کے لیے بصیرت ہدایت اور رحمت تھی تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔''

سُنت قرآن میں

اب قرآن عزیز میں سنت کی ضرورت کو ملاحظہ فرمائیں۔بعض انبیا کا انحصار مدت العمر سنت ہی پر رہا۔سورۂ نساء میں ہے:

① ﴿اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا﴾ [2]

''ہم نے آپ کی طرف وحی کی جیسے حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے بعد آنے والے نبیوں کی طرف کی۔ہم نے حضرت ابراہیم' اسماعیل' اسحاق' یعقوب (علیہم السلام) ان کی اولاد اور حضرت عیسیٰ' ایوب' یونس' ہارون' اور سلیمان (علیہم السلام) کی طرف وحی کی اور ہم نے حضرت داؤد کو زبور مرحمت فرمائی۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی کو حضرت نوح علیہ السلام کے بعد آنے والے تمام انبیا سے تشبیہ دی گئی ہے ان میں حضرت ابراہیم اور حضرت مسیح اور حضرت داؤد علیہم السلام کے سوا باقی انبیا علیہم السلام کے متعلق کسی کتاب کا ذکر نہیں۔ان کی وحی از قسم سنت ہی تھی۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی کو جب متلو اور غیر متلو دونوں قسم کی وحی سے تشبیہ دی گئی ہے تو ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر دونوں قسم کی وحی نازل فرمائی گئی ہے۔قرآنِ عزیز کے الفاظ نازل فرمائے اور سُنت کا مفہوم بتایا گیا۔

[1] ٢٨/القصص:٤٣۔ [2] ٤/النسآء:١٦٣۔

سنت کے متعلق کتاب اللہ اور عقلِ سلیم کی ان تصریحات کی بنا پر ہی علامہ موسیٰ جار اللہ نے فرمایا ہے: (فَالسُّنَنُ فِی الشَّرَائِعِ وَالْقَوَانِیْنِ اَصْلُ الْاُصُوْلِ وَهِیَ فِیْ شَرْعِ الْاِسْلَامِ اَصْلٌ اَوَّلٌ بَیْنَ الْاُصُوْلِ الْاَرْبَعَةِ وَالْكِتَابُ الْكَرِیْمُ یُؤَیِّدُ الْاَصْلَ الْاَوَّلَ وَیُثْبِتُهُ.) [1]

''شریعت اور قانون کے لحاظ سے سنت اصول اربعہ سے پہلا اصل ہے۔ کتاب اللہ اس کی مؤید اور مثبت ہوتی ہے۔''

② ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّیُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِكَ سَبِیْلًا. اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًا. وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ یُفَرِّقُوْا بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ یُؤْتِیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا.﴾ [2]

''جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کا مقام الگ الگ ہو۔ ان کا خیال ہے کہ بعض کے انکار اور بعض کی اطاعت سے کوئی درمیانی سی راہ پیدا ہو جائے یہ لوگ قطعی طور پر دینِ حق کے منکر ہیں اور ایسے منکروں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کیا گیا ہے اور جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں پر یقین رکھتے ہیں اور ان میں سے کسی کی اطاعت میں فرق نہیں کرتے ان کو اس دیانت کا ضرور اجر ملے گا اور اللہ تعالیٰ مغفرت اور رحم کرنے والا ہے۔''

اس آیت میں اسباب کفر کا تذکرہ فرماتے ہوئے بھی اللہ اور اس کے رسول کو الگ الگ اور مستقل حیثیت دی گئی ہے یعنی خدا کا انکار بھی کفر ہے اور رسول ﷺ کا انکار بھی کفر کا سبب ہے۔ اس طرح ایمان کی صورت میں خدا اور انبیا کی حیثیت کو مستقل مقام دیا گیا ہے۔

---

[1] کتاب السنۃ' ص ٤۔ [2] ٤/النساء: ١٤٩ تا ١٥٢۔

یعنی ایمان کا موجب ہونے میں بھی رسول کی مستقل حیثیت ہے۔غرض رسول پر ایمان لانا بھی اتنا ہی ضروری ہے جیسے اللہ پر ایمان لانا اور رسول کا انکار بھی اسی طرح کفر ہے جس طرح خدا کا انکار۔

یہ بھی معلوم ہے کہ رسول اور خدا ذات کے لحاظ سے ایک نہیں ہیں۔ایک خالق ہے دوسرا مخلوق' ایک آمر ہے دوسرا ماموز' ایک مختار مطلق ہے دوسرا محتاج' ایک بے نیاز ہے دوسرا حاجت مند۔آنحضرت ﷺ نے پوری زندگی میں اپنی بے نیازی اور مختارِ مطلق ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں فرمایا اور حقیقت بھی یہی ہے جس کے سر پر موت اور حدوث کی تلوار لٹک رہی ہو وہ خدائی اور بے نیازی اور مختارِ مُطلق ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔اس لحاظ سے دنیا کے عقلمندوں میں نہ کوئی خدا اور انبیا کی وحدت کا قائل ہے نہ اس تفریق کو کفر کہنا قرین دانشمندی ہے۔

بنابریں جس تفریق کو یہاں قطعی کفر کہا گیا ہے۔وہ تفریق فی الاطاعت ہے۔منافقین کی سیرت کا تذکرہ اسی انداز میں فرمایا گیا: ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا﴾ [1]

"جب انہیں خدا اور رسول (ﷺ) کی اطاعت کے لیے دعوت دی جاتی ہے تو منافق تمہارے نام سے بدکتے ہیں۔"

یعنی چونکہ انہیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمودات جوامع الکلم ہیں اس لیے ان میں تاویل کی گنجائش مل جائے گی لیکن آنحضرت ﷺ کی توضیحات وشروح آوارگی کی تمام راہوں کو روک دیتی ہیں۔

اسی وجہ سے اہلِ نفاق کا خیال تھا کہ خدا اور رسول میں بلحاظ اطاعت تفریق قائم رہے۔رسول کے ارشادات کو جب حجت اور اطاعت کے مقام سے گرادیا جائے گا' تو سنت کی تفصیلات سے نجات میسّر آجائے گی اور زندگی کی آوارگیوں کے لیے گنجائش نکل آئے گی مگر قرآن فرماتا ہے: یہ قطعی کفر کی راہ ہے۔سنت کا مقام اطاعت میں قطعاً مستقل ہے جس طرح قرآن کی تصریحات واجب الاطاعت ہیں۔اسی طرح قرآن عزیز کے علاوہ جو تصریحات پیغمبر اسلام سے منقول ہوں گی اگر قرآنی نصوص میں بصراحت موجود نہ ہوں تو بھی ان کی

[1] ٤/النسآء:٦١۔

اطاعت بہ نصِ قرآن فرض ہے اور انکار کفر۔

آیت ❶ میں اسی وحدت فی الاطاعت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اور اہلِ ایمان کا تعارف اسی طرح کرایا گیا ہے۔ ﴿لَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ﴾ ❷

''یعنی یہ لوگ اللہ تعالیٰ اور رسولوں کی اطاعت میں تفریق نہیں کرتے بلکہ دونوں کی اطاعت کو ضروری اور دونوں کے ارشادات کو حجت سمجھتے ہیں۔''

کیونکہ یہ درحقیقت دو نہیں ان کا منبع ایک ہی ہے: ﴿وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ ❸ ''رسول کی اطاعت فی الحقیقت اللہ کی اطاعت ہے۔ ان دونوں اطاعتوں میں فرق نہیں ہے۔'' ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ ❹ ''ہر رسول کی اطاعت اللہ کی اجازت سے ہے۔'' (ارشاد اللہ تعالیٰ کا ہے زبان آنحضرت ﷺ کی)

③ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا﴾ ❺

''اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اللہ ﷺ اور اربابِ حکم و اقتدار کی۔ لیکن اگر ان سے کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کے سپرد کرو۔ اگر تم اللہ اور آخرت پر یقین رکھتے ہو یہ طریق انجام کار بہتر ہے۔''

اس مقام پر قرآنِ عزیز میں تین اطاعتوں کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ پہلی دو اطاعتیں مستقل ہیں جن میں تصادم اور نزاع کا امکان ہی نہیں۔ اس لیے وہاں اس خطرے کا اظہار ہی نہیں فرمایا گیا۔ تیسری اطاعت غیر مستقل اور عارضی قسم کی ہے۔ امرا اور اربابِ اقتدار ممکن ہے کوئی ایسی حرکت کر گزریں جو اللہ کی مرضی اور آنحضرت ﷺ کے ارشادات کے منافی ہو، اس صورت میں ان کی اطاعت ختم ہو جائے گی۔ اربابِ اقتدار کے مصالح کچھ ہی کیوں نہ ہوں ان کو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ نزاع کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اس لیے ان کی اطاعت عارضی ہے مستقل نہیں۔ اُولِي الْاَمْرِ سے مراد خلافتِ الٰہیہ ہو یا امارتِ شرعیہ یا مرکزِ

---

❶ ٤/النسآء: ١٥٢۔ ❷ ٤/النساء: ١٥٢۔ ❸ ٤/النسآء: ٨٠۔
❹ ٤/النسآء: ٦٤۔ ❺ ٤/النسآء: ٥٩۔

ملت ان کی اطاعت عارضی ہوگی اور غیر مستقل' اس کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں رہیں اور ان سے نزاع نہ کریں۔

آیت کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ سربراہ اور قائد کا جو بھی نام رکھا جائے اس کی اطاعت اور وفاداری واجب ہے بشرطیکہ وہ خدا اور اس کے رسول کا وفادار ہو۔

((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ)) [1] اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

④ ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ یَرْجُوا اللّٰهَ وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِیْرًا ۝﴾ [2]

''جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کے لیے آنحضرت ﷺ کی اقتدا ہی بہترین طریق کار ہے۔''

أسوة بالكسر والضم اس حالت کا نام جس میں انسان کسی کی اقتدا کرے۔ یہ اقتدا اچھائی میں ہو یا برائی میں' اسی لیے آنحضرت ﷺ کی اقتدا کو حسن سے مقید فرمایا گیا ہے۔ اس آیت میں مؤکد طور پر فرمایا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ارشادات اور افعال میں ان کی اقتدا اور اطاعت بہترین طریق کار ہے اور یہ اقتدا اور اتباع ہی اللہ تعالیٰ پر ایمان اور آخرت پر یقین کی دلیل ہے۔ اگر آنحضرت ﷺ کی اتباع کا جذبہ کسی دل میں نہیں ہے تو نہ اسے اللہ تعالیٰ سے کوئی امید رکھنی چاہیے نہ قیامت ہی پر اس کا ایمان تصور کیا جا سکتا ہے۔

((مُحَمَّدٌ فَرْقٌ بَیْنَ النَّاسِ)) الحدیث

''کفر اور اسلام میں فرق آنحضرت ﷺ کی شخصیت ہے۔''

یہ آیت سورۂ احزاب میں ہے۔ اس سے پہلے متبنیٰ کی بیوی سے نکاح کے متعلق آنحضرت ﷺ کا فیصلہ ہے پھر امہات المؤمنین کو ہدایات اور ان کے حقوق پھر جنگ میں آنحضرت ﷺ کے احکام کی اقتدا یہ تمام چیزیں اسوہ میں شامل ہیں۔ اس آیت نے دینی اور دنیوی تمام امور میں آنحضرت ﷺ کو اسوہ قرار دیا ہے اور اسے ایمان باللہ اور ایمان

---

[1] تاریخ بغداد' ۳/۱۴۵؛ الدر المنثور فی تفسیر الماثور' ۲/۳۱۶؛ مسند احمد' ۱/۱۳۱؛ ومجمع البحرین' ۴/۳۳۷ رقم ۲۵۶۳؛ ابن حبان' کتاب السیر باب طاعة الأئمة رقم ۴۵۶۸؛ ابوداؤد الطیالسی' رقم ۱۱۱۔

[2] ۳۳/الاحزاب: ۲۱۔

بالآخرت کے لیے اساس قرار دیا ہے۔

قرآن عزیز میں آنحضرت ﷺ کی سیرت بڑے حکیمانہ انداز سے بیان ہوئی۔ اگر ان تمام مقامات کو ایک طالب علم کی طرح بغور پڑھا جائے تو سنت کی حجیت اور آنحضرت ﷺ کے اتباع کی فرضیت میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا بلکہ یہ ایک مستقل باب ہے جس کے لیے کسی دوسری صحبت کا انتظار کرنا چاہیے کہ قرآن میں سیرت کا تذکرہ کس طرح آیا ہے۔ [1]

قرآنِ عزیز نے اس موضوع کو مختلف عنوانات اور مختلف طرق سے بیان فرمایا ہے۔ قرآن کے انداز سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ قرآن کی نگاہ میں یہ مسئلہ ایمان کے لیے ایک اساس اور بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ پیغمبر کو درمیان سے ہٹا دیا جائے تو قرآن اور اسلام دونوں مسکین اور یتیم ہو کر رہ جائیں گے۔

میں نے فیصل آباد کے اجلاس میں اس موضوع پر اختصار سے عرض کیا تھا۔ اہمیت کے لحاظ سے یہاں کسی قدر تفصیل سے عرض کرنا مناسب سمجھا گیا لیکن یہ تفصیل بھی انتہائی اختصار پر مشتمل ہے مزید کسی قدر تفصیل رسالہ ''مقام حدیث'' میں ملے گی جو پہلے شائع ہو چکا ہے۔

حدیث کا کھلا انکار' چودھویں صدی میں

مولوی عبداللہ چکڑالوی پہلے شخص ہیں جنہوں نے علوم سنت کی کھلی مخالفت کی۔ انہیں رسولوں کی اطاعت کا ذکر کھٹکتا رہا۔ انہوں نے رسول کے معنی قرآن کر کے اس اطاعت سے مخلصی چاہی لیکن قرآن اس اطاعت سے بھرا پڑا ہے۔ سورۂ شعرآء میں تقریباً دس جگہ یہ فقرہ دہرایا گیا ہے۔ ﴿فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوْنِ۝﴾ [2] ''اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔''

گویا یہ اطاعت اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کے ہم پایہ چیز ہے۔

آلِ عمران میں فرمایا: ﴿وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ قف فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوْنِ﴾ [3] ''اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔''

قرآنِ عزیز میں مختلف مقامات پر قریب قریب چالیس جگہ رسول کی اطاعت کا ذکر مختلف انداز سے آیا ہے ایک موٹی سمجھ کا آدمی سوچتا ہے کہ ہر جگہ اس کی تعبیر رسول ہی سے

---

[1] کتاب السنۃ ص۷۹ تا ۸۵۔ [2] ۲۶/الشعرآء: ۱۲۶ و ۱۳۰ وغیرہ۔ [3] ۳/آل عمران: ۵۰۔

فرمائی گئی۔ یہ کہیں بھی اصلی لفظ سے تعبیر نہیں کیا گیا حالانکہ کسی جگہ اپنے موقع پر قرآن، فرقان اور کتاب کا ذکر آیا ہے۔ پھر اس تعبیر سے ہر ہر جگہ گریز کی کوئی معقول وجہ ہونی چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول ﷺ کے لفظ سے اس داعی کو تعبیر کیا گیا ہے۔ جو اس دعوت کو لے کر آیا اور ہر زمانے میں اپنی دعوت اور اپنی اس حیثیت کو مستقل طور پر پیش کیا ہے اس لیے مولوی عبداللہ اور ان کے اتباع اور ہم مشرب حضرات کی ان توجیہات میں کوئی معقولیت معلوم نہیں ہوتی اور الرسول کی شخصیت کو نظر انداز کرنے کے بعد سارا کارخانہ اور دیانت کا یہ معمل پورے کا پورا غارت ہو جاتا ہے۔

قرآن اور اس کا تواتر

ہم نے پہلے عرض کیا ہے کہ قرآن کے ہم تک پہنچنے میں تواتر پایا جاتا ہے۔ اس میں سند کے مباحث کی ضرورت نہیں پڑتی مگر یہ تواتر آنحضرت ﷺ سے شروع ہوگا۔ آنحضرت ﷺ اپنے مقام پر اکیلے ہیں۔ سنت اور اس سے عقیدت رکھنے والے لوگ رسول ﷺ، اس کی بشریت اور اس کے لوازم کی بحث آپ سے نہیں چھیڑیں گے لیکن اگر کوئی غیر مسلم آنحضرت ﷺ کی ذات سے متعلق بحث چھیڑ دے تو تواتر سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا کیونکہ اس تواتر میں رسول ﷺ تو اکیلے ہی ہوں گے۔

مسیحی اور یہودی حضرت مسیح کی صلیب کو تواتر اور بہت بڑے اتفاق سے مانتے ہیں لیکن اس تواتر کی انتہا اس جلاد پر ہوتی ہے جس نے آندھی اور گرد و غبار کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں مسیح کو صلیب پر چڑھایا۔ نہ اس وقت وہاں یہودی موجود تھے نہ مسیح علیہ السلام کے حواری، نہ حکومت کا کوئی نمائندہ۔ قرآن عزیز نے اس تواتر کے علی الرغم مسیح کے متعلق صلیب کا انکار فرمایا اور اسی طرح حضرت مسیح کے قتل کا انکار فرمایا ہے۔ قادیانی حضرات اور اس ذہن کے لوگوں کو چھوڑ کر پوری دنیائے اسلام نے اس مشکوک تواتر کی پرواہ نہیں فرمائی اس لیے کہ اس کی ابتدا میں تواتر نہیں۔

منکرینِ حدیث کے طریقِ فکر کے مطابق اگر پیغمبر کی عصمت، پیغمبر کا اجتہاد اور پیغمبر کی تعبیر محلِ نظر ہو تو نبوت اور اس کے عوامل سے اعتماد اُٹھ جائے گا اس کے بعد تواتر سے آپ کو کیا

فائدہ ہوگا۔تواتر کے لیے تو ضروری ہے کہ اس سلسلے کی کوئی کڑی بھی تواتر کے موجبات سے خالی نہ ہواسی صورت میں وہ موجب یقین ہوسکتا ہے۔

اگر قرآن کی حجیت اوراس کے تواتر کو قائم رکھنے کے لیے آپ حضرات از راہ عنایت آنحضرت ﷺ اور تمام انبیا کو اپنی مناظرانہ نکتہ نوازیوں سے معاف فرمادیں اور آپ کے ظنون واوہام کے تیز اور تند حملوں سے اگر مقامِ نبوت محفوظ ہوجائے تو سنت کو بھی ان شاء اللہ کوئی خطرہ نہیں۔آپ کو معلوم ہے سنت اسی پیغمبر کے اعمال شرعیہ کا نام ہے جس نے آپ کے لیے قرآن کو محفوظ فرمایا۔

اوراگران کی ان موشگافیوں اور مظنون خطرات سے مقامِ نبوت نہ بچ سکا تو نہ قرآن کے لیے کوئی پناہ گاہ باقی رہے گی نہ اسلام اورایمان کے لیے کوئی ماخذ اور نہ آپ کی آزادیوں کے لیے کوئی رکاوٹ۔

منکرین سنت کے شبہات

منکرینِ سنت کی کوئی جامع تحریر جس میں سُنت اور آنحضرت ﷺ کے مقام کے خلاف سنجیدگی اور جامعیت سے لکھا گیا ہو میری نظر سے نہیں گزری۔بعض احادیث پر کچھ شبہات وارد کیے گئے ہیں جن کا زیادہ سے زیادہ یہ اثر ہونا چاہیے کہ ان چند احادیث کا انکار کر دیا جائے جن کے معنیٰ کے متعلق تسکین نہ ہوسکی۔چند احادیث یا چند شبہات کی بنا پر پورے ذخیرے کا انکار کر دینا قطعاً دانش مندی نہیں۔اگر کسی شوریدہ سر کو قرآن عزیز کی بعض آیات سمجھ میں نہ آئیں کوئی سمجھ دار آدمی پسند نہیں کرے گا کہ پورے قرآن کا انکار کر دیا جائے۔

ان حضرات کی شاندار تحریرات سے چند شبہات اخذ ہوسکے ہیں انہیں کے متعلق یہاں کچھ گزارش کرنا پیشِ نظر ہے۔

قابل اعتراض روایات اور بعض اہم شبہات کے متعلق میں اپنی گزارشات مولانا مودودی صاحب کے ''نظریۂ حدیث کا تنقیدی جائزہ [1]۔''میں عرض کر چکا ہوں۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعریضات اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تھپڑ مارنا' ان پر بقدرِ ضرورت عرض کر چکا

---

[1] یہ کتاب اسی عنوان کے ساتھ پیشِ خدمت مجموعہ میں شامل ہے۔

ہوں یہاں صرف اصولاً کچھ عرض کرنا مقصود ہے۔

حدیث کے متعلق ظنّی ہونے کا شبہ

فنِ حدیث کے متعلق اوہام ووساوس نے جب سے تحریک کی صورت اختیار کی ہے اور بعض اربابِ فکر نے ان وساوس کو کاروبار کے انداز سے پیش کرنا شروع کیا اس وقت سے عوام کی نگاہ میں یہ اوہام دلائل کی صورت اختیار کر گئے ہیں اور انکارِ حدیث ایک مشغلہ سا بن گیا ہے۔ غیر علمی زبانوں پر متعارف اصطلاحات غیر اصطلاحی معانی استعمال ہو کر بعض سادہ لوح حضرات کے لیے لغزش کا موجب ہو رہی ہیں۔ ان ہی اصطلاحات سے ایک اصطلاح ''ظن'' کی بھی ہے۔ حدیث کے متعلق یہ شبہ بھی پیدا کیا گیا ہے کہ یہ ظنی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس سے متعلقہ گردوغبار کو صاف کیا جائے جو تحریک انکارِ حدیث نے فضا میں اٹھا رکھا ہے۔

ظن کی علمی تحقیق

ظن کے شرعی، عرفی اور لغوی مفہوم پر غور کرنے سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اس مغالطہ کا پس منظر کیا ہے؟

ظن کا لفظ عربی اور اُردو دونوں زبانوں میں مستعمل ہے لیکن اردو میں اس کا استعمال شک، وہم کے مفہوم میں ہوتا ہے عموماً مشکوک، موہوم، مظنون وغیرہ الفاظ بصورت مترادف استعمال کیے جاتے ہیں اور یہی استعمال ہمارے منکرینِ سنت حضرات کے لیے لغزش کا موجب ہوا ہے۔

ورنہ عربی زبان میں یہ لفظ بلاقرینہ اس معنی میں استعمال نہیں ہوا۔ راغب فرماتے ہیں:

((اَلظَّنُّ اِسْمٌ لِمَا يَحْصُلُ عَنْ اِمَارَةٍ وَمَتٰى قَوِيَتْ اَدَّتْ اِلَى الْعِلْمِ وَمَتٰى ضَعُفَتْ جِدًّا لَمْ يَتَجَاوَزْ حَدَّا التَّوَهُّمِ.)) [1]

''جو علم آثاروقرائن سے حاصل ہو اُسے ظن کہتے ہیں، اگر آثاروقرائن مضبوط ہوں تو یہ لفظ علم ویقین کے مترادف ہوگا اور جب یہ قرائن جہت ہی کمزور ہوں تو بھی وہم سے کم

[1] مفردات القرآن، ص ۳۲۰ مادہ ظ ن ن۔

تر نہیں ہوگا۔"

محمد بن مکرم بن منظور فرماتے ہیں:

اَلظَّنُّ شَکٌّ وَیَقِیْنٌ اِلَّا اَنَّهٗ لَیْسَ بِیَقِیْنِ عِیَانٍ اِنَّمَا هُوَ یَقِیْنُ تَدَبُّرٍ تَدَبُّرًا ❶

"ظن یقین اور شک دونوں معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے لیکن یہ یقین استدلالی ہوتا ہے عینی نہیں ہوتا۔"

تہذیب الصحاح ج ۳ میں ہے:

اَلظَّنُّ یَقِیْنٌ وَشَکٌّ وَاَنْشَدَ اَبُوْ عُبَیْدَةَ

ظَنِّیْ بِهِمْ کَعَسٰی وَهُمْ بِتَنُوْفَةٍ
یَتَنَازَعُوْنَ جَوَائِزَ الْاَمْثَالِ ❷

اقرب الموارد، قاموس منجد وغیرہ کتب لغت میں بھی اس قسم کی تصریحات موجود ہیں۔ ان تصریحات کی روشنی میں ظن کا عربی مفہوم تو واضح ہو جاتا ہے یعنی یہ لفظ علم ویقین میں بھی استعمال ہوتا ہے اور شک وتخمین کے مفہوم میں بھی بولا جاتا ہے۔ انحصار قرائن پر ہے۔ جیسے قرائن ہوں گے ویسے ہی معانی میں استعمال ہوگا۔

علمائے عربیت کی رائے اس کے متعلق اور بھی صاف ہے۔ علامہ ابوالبقاء یعیش بن علی بن یعیش ۶۴۳ھ مفصل زمخشری کی شرح میں فرماتے ہیں:

اَلظَّنُّ اَنْ یَتَعَارَضَ دَلِیْلَانِ وَیَرَجَّحَ اِحْدَاهُمَا عَلَی الْاٰخَرِ وَقَدْ یَقْوَی الْمُرَجَّحُ فَیُسْتَعْمَلُ بِمَعْنَی الْعِلْمِ وَالْیَقِیْنِ نَحْوُ قَوْلِهٖ تَعَالٰی ﴿اَلَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلَاقُوْا رَبِّهِمْ﴾ ❸

"دو متعارض دلیلوں کا نام ظن ہے اور جب راجح قوی ہو تو اسے علم ویقین سے تعبیر کیا جاتا ہے جیسے ﴿یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلَاقُوْا رَبِّهِمْ﴾ ❹ سے ظاہر ہوتا ہے۔"

پھر اسی کتاب کی ساتویں جلد میں مسئلہ اور بھی صاف فرما دیا ہے قول اور رویت بھی کبھی

❶ لسان العرب لابن منظور مادہ ظنن ۹/۱۹۶؛ مجاز القرآن ۲/البقرہ: ۱/۳۹۔
❷ لسان العرب مادہ ظنن: ۹/۱۹۷۔ ❸ ابن یعیش، ۲/۷۷۔ ❹ ۲/البقرہ: ۴۶۔

ظن ہی کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔

غرض حواس ظاہری سے جو چیز معلوم کی جائے اسے ضروری یا بدیہی کہنا چاہیے اسی طرح جو چیزیں وجدان سے تعلق رکھتی ہیں وہ بھی بدیہی اور ضروری ہوں گی۔اور جو چیزیں عقل سے تعلق رکھتی ہیں اگر عقلی دلائل متعارض ہوں اور ترجیح کی کوئی وجہ نہ ہو تو اسے تردد یا شک کہنا چاہیے اور اگر ترجیح کے دلائل مل جائیں تو راجح کو ظن کہا جاتا ہے اور مرجوح کو شک یا وہم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ [1]

علامہ حسین بن محمد بن مفضل راغب اصفہانی ۵۰۲ھ نے مفردات القرآن میں ان قرائن کو ایک قاعدہ کی صورت دی ہے' فرماتے ہیں:

وَمَتٰی قَوِیَ اَوْ تُصُوِّرَ الْقَوِیّ اِسْتَعْمَلَ مَعَهُ اَنَّ الْمُشَدَّدَةُ وَاَنْ اَلْمُخَفَّفَةُ مِنْهَا وَمَتٰی ضَعُفَ اِسْتَعْمَلَ اَنْ وَاَنْ اَلْمُخْتَصَّهُ بِالْمَعْدُوْمِیْنَ مِنَ الْقَوْلِ وَالْفِعْلِ. [2]

''جب قرائن قوی ہوں تو ظن کا استعمال اَنَّ مشدد اور اَنْ مخفف کے ساتھ استعمال ہو گا اور جب قرائن کمزور ہوں تو اَنَّ اور اَنْ مخففہ کے ساتھ مستعمل ہوگا جو معدومات میں عموماً استعمال ہوتے ہیں۔''

اس کے بعد قرآن کریم سے اس کی تائید میں کافی امثلہ دی ہیں۔

① ﴿اَلَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ.﴾ [3]

''جنہیں یقین ہے کہ وہ اللہ سے ملیں گے۔''

② ﴿اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۙ لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ ۙ﴾ [4]

''کیا انہیں یقین نہیں کہ وہ ضرور اٹھیں گے۔''

③ ﴿وَظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ۙ﴾ [5]

''اسے یقین ہوتا ہے کہ اب جان گئی۔''

④ ﴿وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ.﴾ [6]

---

[1] ابن یعیش' ج۷ ص۷۸۔۸۱۔ [2] مفردات القرآن' ۳۲۰ نار ظ'ن'ن'۔

[3] ۲/البقرہ:۴۶۔ [4] ۸۳/المطففین:۴،۳۔ [5] ۷۵/القیامۃ:۲۸۔ [6] ۵۹/الحشر:۲۔

''انہیں یقین تھا کہ یہ قلعے ان کو بچالیں گے۔''

⑤ ﴿اِنَّا ظَنَنَّا اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِی الْاَرْضِ.﴾ ❶

''ہمیں یقین ہے کہ ہم اللہ کو کمزور نہیں کر سکتے۔''

⑥ ﴿وَاَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا○﴾ ❷

''انہیں بھی تمہاری طرح یقین تھا کہ اللہ کوئی نبی نہیں بھیجے گا۔''

⑦ ﴿بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ.﴾ ❸

''تمہیں یقین تھا کہ آنحضرت ﷺ (تبوک سے) واپس نہیں ہوں گے۔''

ان تمام مواقع میں ظن علم و یقین کے معنی میں استعمال ہوا ہے فی الواقع ہو یا متکلم کے خیال کے مطابق۔

آپ قرآن عزیز میں اگر ایک طالب علم کی طرح غور کریں گے تو وہاں یہ فرق اور طریق سے بھی واضح فرمایا گیا ہے جہاں ظن کو حق کے مقابل ذکر کیا گیا ہے وہاں شک اور وہم کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

﴿اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِىْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا.﴾ ❹

''ظن حق کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔''

﴿اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ○﴾ ❺

''ہمارا خیال ہے یقین نہیں۔''

﴿اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ.﴾ ❻

''یہ لوگ ظن اور ہوائے نفس کے تابع ہیں۔''

غلطی کی اصل وجہ

غلطی کی اصل وجہ ظن کا پنجابی زبان میں استعمال ہے اور ان حضرات کی عربی زبان اور اس کے محاورات سے ناواقفیت ائمہ حدیث کی نظر میں ظنیت اس معنی سے ہے کہ حدیث کی صحت عقلی دلائل سے ثابت ہے عینی اور سمعی چیز نہیں بلکہ ائمہ حدیث نے رجال کے احوال اور

---

❶ ۷۲/الجن:۱۲۔ ❷ ۷۲/الجن:۷۔ ❸ ۴۸/الفتح:۱۲۔
❹ ۵۳/النجم:۲۸۔ ❺ ۴۵/الجاثیه:۳۲۔ ❻ ۵۳/النجم:۲۳۔

قرائن سے استدلال فرما کر بحث ونظر' عقل اور شعور سے احادیث کی صحت اور حجیت کو ثابت فرمایا ہے۔ یہ ایسی چیز نہیں ہے جسے نظر سے دیکھا جائے یا کانوں سے سنا جائے بلکہ یہ علم ویقین عینی اور سمعی علم ویقین سے دوسرے مرتبہ پر ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ جو چیزیں ہماری نظر کے سامنے ہیں یا ہم کانوں سے سنتے ہیں ان کا ہمیں علم اور یقین تو ہو جاتا ہے لیکن قطعیت وہاں بھی محلِ نظر ہے۔ ستاروں کے حجم میں نظر کا فیصلہ درست نہیں۔ مرئیات اور اشباح میں نظر کی غلطی مسلمہ حقیقت ہے حالانکہ وہ اشیاء ہماری نظر کے سامنے ہیں' پہاڑوں کے سر بفلک درخت جو بیسویں گز فضا میں چلے گئے ہیں۔ دور سے جھاڑیاں محسوس ہوتے ہیں جب عین الیقین یا علم بالعیان میں بھی غلطی کی گنجائش ہے تو قطعیت کا وجود دنیا میں نادر ہی معلوم ہوتا ہے۔

منکرینِ حدیث کے لیے دو راہیں رہ جاتی ہیں یا تو عام بنی آدم کی طرح ظنیات کو اخبار اور احکام میں بھی قبول کریں یا پھر کسی ایسی دنیا میں چلے جائیں جہاں انہیں ظنیات سے سابقہ نہ پڑے اور ان کا ماحول جزم ویقین سے بھرپور ہو متواتر احادیث شاید سینکڑوں مل جائیں مگر قطعیات کا وجود اس دنیا میں بے حد کم ہے۔

شریعت اسلامیہ میں ظن کی اہمیت

عام دنیا کو جانے دیجیے' شریعت میں مظنون چیزوں کو اعتقاد کا مرتبہ دیا گیا ہے۔ محکمہ قضا شرعی احکام میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ ہر قاضی جو فیصلہ کرتا ہے وہ صحیح ہی ہوتا ہے۔ بددیانت قضاۃ کو چھوڑیے۔ دیانت دار قاضی بھی معصوم نہیں ہو سکتا۔ بالکل ممکن ہے کہ وہ بڑی نیک نیتی سے فیصلہ کرے لیکن وہ واقعۃً صحیح نہ ہو۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "بعض تم میں سے اپنا عندیہ بڑی فصاحت اور بلاغت سے بیان کرتے ہیں میں ان کے حق میں فیصلہ صادر کر دیتا ہوں لیکن واقعۃً وہ فیصلہ درست نہیں ہوتا اس لیے میرا یہ فیصلہ حرام کو حلال نہیں کر سکتا۔" [1] جب آنحضرت ﷺ اپنے فیصلوں کے متعلق یہ ارشاد فرمائیں تو

---

[1] بخاری' كتاب الشهادات :باب من اقام البينة بعد اليمين' رقم ٢٦٨٠؛ مسلم' كتاب الاقضية : باب بيان ان حكم الحاكم لا يغير الباطن' رقم ٤٤٧٣؛ ابو داؤد' كتاب القضاء' باب فى قضاء القاضى اذا اخطاء' رقم:٣٥٨٣؛ ترمذی' كتاب الاحكام :باب ما جاء فى التشديد على من يقضى له لشئ' رقم١٣٣٩۔

یقین اور قطعیت کہاں سے آئے گی۔

شہادت

محکمہ قضا کا تمام تر انحصار شہادت اور قرائن پر ہے لیکن ہمیں بداہتہً معلوم ہے کہ شہادت غلط بھی ہوتی ہے۔ غلط فہمی پر بھی مبنی ہو سکتی ہے اس کی صحت بھی بہر کیف ظنی ہے اور اسی ظن ہی کی بنا پر تمام عدالتیں موجود ہیں۔ جو کام کر رہی ہیں شرعی اور قانونی طور پر پوری عدلیہ کا انحصار شہادت پر ہے اور یہ از اوّل تا آخر ظنّی ہے۔

شہادت میں عدالت وغیرہ کی شروط عائد فرما کر اسی ظن میں ایک گونہ اعتماد کی کوشش کی گئی ہے۔ (1) شوافع اور ائمہ حدیث نے ایک شہادت کے ساتھ یمین (قسم) کا اضافہ کرنے کا فیصلہ فرمایا تھا تاکہ اس میں اس قدر رجحان پیدا ہو سکے جو اسے ظن کے قریب لے آئے۔

﴿فَإِنْ عُثِرَ عَلَىٰٓ أَنَّهُمَا ٱسْتَحَقَّآ إِثْمًا فَـَٔاخَرَانِ يَقُومَانِ مَقَامَهُمَا.﴾ (2)

"اگر سابقہ دونوں گواہوں پر گناہ (جھوٹی شہادت) کا شبہ ہو جائے تو دوسرے دو ان کی جگہ کھڑے ہو جائیں۔"

اس آیت میں شہادت کے غلط ہونے یا اس کے امکان کا پتہ دیا گیا ہے۔ جب یہ امکان موجود ہے تو شہادت کی صداقت ظنی ہو جائے گی۔

تحکیم

تحکیم بھی قضا کے قریب قریب ہے۔ اس میں بھی اسی طرح ظنیت موجود ہے۔ اگر حاجی کسی جانور کا شکار کر گزرے تو اس کے عوض اس طرح کا جانور دینے کے لیے فرمایا گیا ہے۔

﴿يَحْكُمُ بِهِۦ ذَوَا عَدْلٍ مِّنكُمْ هَدْيًۢا بَـٰلِغَ ٱلْكَعْبَةِ﴾ (3)

"ہدی کی مثلیت کا فیصلہ دو عادل آدمی کریں گے۔"

یہ حکم یقیناً ظنی ہے آیا یہ جانور بالکل شکار کی مثل ہے یا نہیں؟

خاوند اور بیوی کے باہم تنازعات کے متعلق فرمایا گیا۔

---

(1) موسوعۃ الفقہ الاسلامی" ۱۲/ ۲۹٤ بحث اشہاد۔ (2) ۵/المآئدۃ:۱۰۷۔

(3) ۵/المآئدۃ:۹۵۔

﴿فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَا اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا.﴾ ❶

''میاں بیوی دونوں فریق کی طرف سے ایک ایک حکم مقرر کر دیا جائے۔ اگر اصلاح کا ارادہ ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس کی توفیق مرحمت فرمائے گا۔''

اِنْ شرطیہ سے اس تحکیم کی ظنیت ظاہر فرمادی گئی ہے اور ان مقامات میں تحکیم کا حکم قرآنِ عزیز نے شرعاً دیا ہے۔ عموی مصالح مفاسد ظن پر مبنی ہیں۔ معلوم نہیں منکرینِ حدیث کے کان میں کس نے کہہ دیا کہ ظن شرعاً مستند نہیں۔ اب ہم حافظ عزالدین عبدالعزیز بن عبدالسلام ۶۶۰ھ کی شہادت پر اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔ شیخ فرماتے ہیں:

فَصْلٌ فِي بَيَانِ جَلْبِ مَصَالِحِ الدَّارَيْنِ وَدَرْءِ مَفَاسِدِهِمَا عَلَى الظُّنُوْنِ وَالْإِعْتِمَادِ فِي جَلْبِ مُعْظَمِ مَصَالِحِ الدَّارَيْنِ وَدَرْءِ مَفَاسِدِهِمَا عَلٰى مَا يَظْهَرُ فِي الظُّنُوْنِ وَلِلدَّارَيْنِ مَصَالِحُ إِذَا اَفَاتَتْ فَشَلَ اَمْرُهُمَا وَمَفَاسِدُ إِذَا تَحَقَّقَتْ هَلَكَ اَهْلُهَا وَتَحْصِيْلُ مُعْظَمِ هٰذِهِ الْمَصَالِحِ بِتَعَاطِيْ اَسْبَابِهَا مَظْنُوْنٌ غَيْرُ مَقْطُوْعٍ بِهٖ فَإِنَّ عُمَّالَ الْآخِرَةِ لَا يَقْطَعُوْنَ بِحُسْنِ الْخَاتِمَةِ وَإِنَّمَا يَعْمَلُوْنَ بِنَاءً عَلٰى حُسْنِ الظَّنِّ وَهُمْ مَعَ ذٰلِكَ يَخَافُوْنَ اَلَّا يُقْبَلَ مِنْهُمْ مَا يَعْمَلُوْنَ وَقَدْ جَاءَ التَّنْزِيْلُ بِذَالِكَ فِيْ قَوْلِهٖ ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ۝﴾ ❷ (فَكَذَالِكَ اَهْلُ الدُّنْيَا إِنَّمَا يَتَصَرَّفُوْنَ بِنَاءً عَلٰى حُسْنِ الظُّنُوْنِ وَإِنَّمَا اعْتَمَدْنَا عَلَيْهَا لِاَنَّ الْغَالِبَ صِدْقُهَا عِنْدَ قِيَامِ اَسْبَابِهَا فَإِنَّ التُّجَّارَ يُسَافِرُوْنَ عَلٰى ظَنِّ اَنَّهُمْ يَسْلَمُوْنَ وَيَرْبَحُوْنَ وَالصُّنَّاعُ يَخْرُجُوْنَ مَنَازِلَهُمْ عَلٰى اَنَّهُمْ يُسْتَعْمَلُوْنَ بِمَا بِهٖ يَرْتَفِعُوْنَ وَالْاَكَّاذُوْنَ يَحْرِثُوْنَ وَيَزْرَعُوْنَ بِنَاءً عَلٰى اَنَّهُمْ مُسْتَغِلُّوْنَ وَالْجَمَّالُوْنَ وَالْبَغَّالُوْنَ يَتَصَدَّوْنَ لِلْكِرَاءِ لَعَلَّهُمْ يُسْتَاْجَرُوْنَ وَالْمُلُوْكُ يُجَنِّدُوْنَ الْاَجْنَادَ

❶ ٤/النسآء:٣٥۔ ❷ ٢٣/المؤمنون:٦٠۔

وَيُحْصِنُوْنَ الْبِلَادَ بِنَاءً عَلٰى اَنَّهُمْ بِذَالِكَ يَنْتَصِرُوْنَ وَكَذَالِكَ يَاْخُذُ الْاَجْنَادُ الْحِذرَ وَالْاَسْلِحَةَ عَلٰى ظَنٍّ اَنَّهُمْ يَغْلِبُوْنَ وَيَسْلَمُوْنَ وَالشُّفَعَاءُ يَشْفَعُوْنَ عَلٰى ظَنِّ اَنَّهُمْ يُشَفَّعُوْنَ.)

(وَالْعُلَمَاءُ يَشْتَغِلُوْنَ بِالْعُلُوْمِ عَلٰى ظَنِّ اَنَّهُمْ يَنْجَحُوْنَ وَيَتَمَيَّزُوْنَ وَكَذَالِكَ النَّاظِرُوْنَ فِي الْاَدِلَّةِ وَالْمُجْتَهِدُوْنَ فِي تَعَرُّفِ الْاَحْكَامِ يَعْتَمِدُوْنَ فِي الْاَكْثَرِ عَلٰى ظَنِّ اَنَّهُمْ يَظْهَرُوْنَ بِمَا يَطْلُبُوْنَ وَالْمَرْضٰى يُدَاوُوْنَ لَعَلَّهُمْ يُشْفَوْنَ وَيَبْرَءُوْنَ وَيَبْدُوْنَ وَمُعْظَمُ هٰذِهِ الظُّنُوْنُ صَادِقٌ مُوَافِقٌ غَيْرُ مُخَالِفٍ وَلَا كَاذِبٍ فَلَا يَجُوْزُ تَعْطِيْلُ هٰذِهِ الْمَصَالِحِ الْغَالِبَةِ الْمُوْقُوْعِ خَوْفًا مِنْ نُدُوْرِ كِذْبِ الظُّنُوْنِ وَلَا يَفْعَلُ ذٰلِكَ اِلَّا الْجَاهِلُوْنَ.) [1]

''یہ دین اور دنیا کی برکات کا حصول اور ان کے مفاسد سے بچنے کے تمام ذرائع ظنی ہیں۔ دونوں جہان کے مصالح کی تحصیل اور مفاسد سے بچنے میں بظاہر اعتماد ظن پر ہے۔ دونوں جہان میں کچھ ایسے مصالح ہیں اگر وہ ناپید ہو جائیں تو ان کا معاملہ بگڑ کر رہ جائے گا اور کچھ خرابیاں ہیں اگر وہ موجود رہیں تو دنیا میں تباہی آ جائے گی۔ ان مصالح کی تحصیل کے عمومی ذرائع ظنی ہیں قطعی نہیں۔ آخرت کے لیے جو عمل کیے جاتے ہیں ان میں ضروری نہیں کہ انجام صحیح ہو۔ اعمال حسنِ ظن ہی کی بنا پر کیے جاتے ہیں اور یہ خطرہ بدستور رہتا ہے کہ شاید یہ عمل قابلِ قبول نہ ہوں اور قرآن عزیز میں بھی اس کی شہادت موجود ہے۔''

﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ۝﴾ [2]

''وہ لوگ خرچ کرتے ہیں اور ان کے دل ڈرتے ہیں۔''

اسی طرح دنیادار جس قدر کاروبار کرتے ہیں وہ حسنِ ظن ہی کی بنا پر کرتے ہیں۔ ہمیں

[1] قواعد الاحکام فی مصالح الانام' ص۳' فصل فی بیان جلب مصالح الدارین ودرء مفاسدهما علی الظنون۔ [2] ۲۳/المؤمنون: ٦٠۔

یہ حسنِ ظن ہے کہ اگر یہ اسباب میسر آ جائیں تو غالباً یہ معاملات صحیح اور درست ہو جائیں گے۔ لوگ تجارتی سفر اسی حسنِ ظن کی بنا پر کرتے کہ وہ صحیح سلامت بھی رہیں گے اور ان کو فائدہ بھی ہوگا۔ کسان کھیتی باڑی اس حسنِ ظن کی بنا پر کرتے ہیں کہ انہیں اس سے آمدنی ہوگی۔ اونٹ خچروں کے مالک بھی حسنِ ظن ہی کی بنا پر نکلتے ہیں کہ انہیں اجرت میسر آ جائے گی۔

بادشاہ اسی خیال سے لشکر کشی کرتے ہیں' قلعے تعمیر کرتے ہیں کہ انہیں فتح حاصل ہوگی اور فوجیں بھی اپنا بچاؤ اور اسلحہ کا استعمال اسی لیے کرتی ہیں کہ انہیں غلبہ حاصل ہوگا اور سفارشیں بھی اسی لیے کی جاتی ہیں کہ شاید انہیں قبول کر لیا جائے گا۔

علما بھی اسی ظن سے علوم پڑھتے ہیں کہ انہیں امتیازی مقام حاصل ہوگا۔ اور مناظر اور مجتہد ادلہ میں زیادہ تر اعتماد ظنیات پر ہی کرتے ہیں اور کامیابی کی امید رکھتے ہیں۔ بیمار بھی علاج میں اسی لیے کوشش کرتے ہیں کہ شاید انہیں شفاء حاصل ہوگی اور اکثر اوقات یہ ظن صحیح اور درست ثابت ہوتا ہے غلط اور جھوٹ نہیں ہوتا' ان مصالح کو معطّل کرنا اس لیے کہ ان میں کبھی کبھی ناکامی بھی ہو جاتی ہے اور نادر طور پر یہ ظن درست ثابت نہیں ہوتے محض جہالت اور نادانی ہے۔''

ظاہر ہے کہ ساری کائنات دنیا بامید قائم کی بنیاد پر چل رہی ہے۔ شارع نے بھی اپنے اکثر احکام کی بنیاد ظن پر رکھی ہے۔ متمدن دنیا کے مختلف طبقات بھی ظن اور امید ہی کے سہارے پر چل رہے ہیں۔ ائمہ حدیث نے حدیث پر تنقید' تصحیح اور تصنیف کی بنیاد کے بالمقابل کہیں زیادہ یقینی امور پر رکھی ہے اس کے باوجود انہوں نے اصطلاح کے لیے ظن کا لفظ پسند فرمایا جسے ہمارے منکرینِ حدیث نے شک وشبہ کے معنیٰ میں لے کر اس کا انکار کر دیا ہے۔ یہ غلطی زبان اور اس کے تصرفات سے لاعلمی کی بنا پر ہوئی۔ عربی زبان میں ''مکر'' تدبیر کے معنیٰ میں استعمال ہوتا تھا۔ پھر بُری تدبیر کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا۔ جب اسے اردو اور پنجابی میں استعمال کیا گیا تو اس کا معنیٰ دھوکہ اور فریب کیا گیا۔ بیچارے پنڈت دیانند ایسے کم علم آدمی نے قرآن پر اعتراض جڑ دیا کہ اس میں خدا تعالیٰ کو مکّار کہا گیا ہے۔

وَكَمْ مِنْ عَائِبٍ قَوْلاً صَحِيْحًا

وَافَتُهُ مِنَ الْفَهْمِ السَّقِيْمِ

شریعت نے ہر مناسب مرحلہ پر اس ظن کو قابلِ اعتماد و استناد سمجھا ہے اور اس پر احکام کی بنیاد رکھی ہے۔

حافظ ابنِ رجب حنبلی فرماتے ہیں:

وَالشَّارِعُ لَمْ يُكَلِّفِ الْعِبَادَ بِمَا فِي نَفْسِ الْاَمْرِ بَلْ بِمَا ظَهَرَ وَبَدَا وَاِنْ كَانَ مُخَالِفًا لِنَفْسِ الْاَمْرِ. ❶

''شارع نے اپنے بندوں کو یہ تکلیف نہیں دی کہ وہ نفس الامر کی تلاش کریں بلکہ اس کی جو کچھ بظاہر موجود ہو گو وہ نفس الامر اور واقع کے خلاف ہو۔''

قرآنِ عزیز نے فرمایا: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ ❷

''انسان کو اس کی وسعت اور توفیق کے مطابق تکلیف دی ہے۔''

جو چیز اس کے بس میں نہیں وہ اس کا مکلف نہیں جہاں تک شبہات کا مداوا ہو سکتا ہے کرنا چاہیے۔ جہاں ممکن نہ ہو وہاں اپنے آپ کو شکوک و شبہات کی بھینٹ نہیں چڑھانا چاہیے۔ائمہ حدیث نے بھی یہی کہا ہے۔

ایک بدبودار شبہ

انکارِ حدیث کے نظریہ کی عمر تقریباً ستر سال ہو گی جس کی ابتدا مولوی عبداللہ صاحب' مولوی حشمت علی صاحب لاہور' مولوی رمضان صاحب گوجرانوالہ' رشید الدولہ صاحب گجرات' منکرینِ حدیث ملتان' ڈیرہ غازیخاں وغیرہ نے کی اور حدیث اور ائمہ حدیث کے اصول پر کڑی تنقید کی ہیں۔لیکن حدیث میں فارسی سازش کا کبھی شبہ ان حضرات نے نہیں کیا۔ تاریخ سازی کا یہ انکشاف صرف ادارۂ طلوعِ اسلام اور مولانا جیراج پوری کے حصہ میں آیا ہے۔ان حضرات کا خیال ہے کہ ائمہ حدیث میں چونکہ کافی تعداد اہلِ فارس کی ہے۔ فارسی حکومت چونکہ پہلی صدی ہی میں ختم ہو چکی تھی۔ یزدجرد کی موت کے بعد فارسی اقتدار ہمیشہ کے لیے دم توڑ گیا۔منکرینِ حدیث کا خیال ہے کہ ائمہ حدیث نے فارسی حکومت کے بقیہ

❶ القواعد' ص٣٥٦۔ ❷ ٢/البقرہ: ٢٨٥۔

السیف کے ساتھ مل کر اسلام کی تخریب کے لیے سازش کی اور احادیث کے یہ طویل وعریض دفاتر، رجال کا یہ علمی اور تاریخی ذخیرہ، اصول حدیث کے عقلی اور لغوی قواعد یہ سب اس شکست کا نتیجہ ہیں جو فارسی حکومت کے افراد اور علما کی سازش سے وجود میں آئی اور اسی سے اسلام میں تخریب کی راہ پیدا ہوئی۔ چند سال سے اس تہمت کو بے حد ہوا دی جا رہی ہے۔ فتح فارس کی وجہ سے آج کا بے خبر ذہن اسے قبول بھی کر رہا ہے۔

میں اس پر ذرا تفصیل سے تبصرہ کرنا چاہتا ہوں، میں اس پوری داستان کو محض افسانہ اور افترا سمجھتا ہوں۔ میری دانست میں یہ محض وہم ہے۔ اس کے لیے کوئی دلیل نہیں بلکہ جو حضرات اس سازش کا پراپیگنڈہ کر رہے ہیں وہ خود کسی کی سازش کا شکار ہیں۔

سازش کے اسباب

آج کے جمہوری دور میں حکومت پورے ملک کی ہوتی ہے۔ انتخاب کے مروجہ طریقوں میں یہ اساسی طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ اربابِ حکومت پورے ملک کی نمائندگی کرتے ہیں۔ چونکہ یہ لوگ عوام کے سامنے جواب دہ ہیں اور عوام کے ووٹ نے انہیں اقتدار بخشا ہے۔ اس لیے یہ عوام کی حکومت ہے۔ ایسی حکومت اگر برباد ہو جائے تو یہ سمجھنا مشکل ہوتا ہے کہ اقتدار پورے ملک سے نکل کر اجنبی ہاتھوں میں چلا گیا۔ اس لیے ان حالات میں سازش کا امکان ہو سکتا ہے۔

آج سے تقریباً ایک صدی پہلے حکومت نہ انتخابی تھی نہ جمہوری نمائندگی کی سند ان کو حاصل تھی۔ نہ وہ حکومتیں عوام کے سامنے جواب دہ ہوتی تھیں بلکہ اس وقت کی حکومتیں شخصی ہوتی تھیں یا زیادہ سے زیادہ کوئی قوم حاکم ہو جاتی باقی لوگ محکوم ہوتے تھے۔ اقتدار میں عوام کی جواب دہی قطعاً ملحوظ نہیں رکھی جاتی تھی نہ ہی حکومت کسی آئین کی پابندی ہوتی تھی۔ بادشاہ کی رائے اور بادشاہ کا قلم پورا آئین ہوتا تھا یا وہ لوگ جو بادشاہ کی ہاں میں ہاں ملا کر حکومت کے منظورِ نظر ہو جائیں۔

ایسی حکومتوں کے ساتھ ہمدردی ذاتی ضرورتوں کی وجہ سے ہوتی تھیں یا بادشاہ کے ذاتی اخلاق اور کیرکٹر کی وجہ سے اگر کوئی انقلاب ہو جائے تو انقلاب سے ملک متاثر تو ہوتا تھا لیکن

اس کی وجہ بادشاہ یا اس کے خاندان کے ساتھ ہمدردی نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ یہ تاثر آنے جانے والی حکومتوں کے ذاتی مقاصد کی وجہ سے ہوتا۔

فارس کی حکومت شخصی حکومت تھی۔ یزدجرد کی موت پر اس کا خاتمہ ہو گیا۔ یزدجرد خاندان یقیناً اس انقلاب میں پامال ہوا ہوگا لیکن تاریخ اس وقت کسی ایسی سازش کا پتہ نہیں دیتی جو اس خاندان کے ساتھ ہمدردی کے طور پر کی گئی ہو۔

نوشیرواں کے بعد ویسے بھی فارس کی حکومت روبانحطاط تھی۔ ان کے کردار میں عدل وانصاف کی بجائے استبداد روز بروز بڑھ رہا تھا۔ عوام کو حکومت کے ساتھ کوئی دلچسپی اور محبت نہیں تھی۔ پھر سازش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مذہباً فارسی حکومت آتش پرست تھی۔ اسلام نے توحید کے عقیدہ کی سادگی سے یہودیت اور عیسائیت تک کو متاثر کیا۔ بت پرستی اس کے سامنے نہ ٹھہر سکی۔ آتش پرستی کی وہاں کیا مجال تھی۔ اسلام کی تعلیمات اس مسئلہ میں نہایت مدلل اور واضح تھیں۔ ان میں کوئی چیز ڈھکی چھپی نہ تھی۔ اسلام کا موقف عقیدۂ توحید کے معاملہ میں کھلی کتاب تھی۔ وہ دوسروں کے شبہات اور اعتراضات بڑی کشادہ دلی سے سنتا تھا۔ مخالفین کے شبہات کی تردید اور اصلاح میں کوئی کوتاہی نہیں کرتا تھا نہ ہی اپنے نظریہ کو کسی پر جبراً ٹھونستا تھا۔ پھر اس کے خلاف کیوں سازش کی جائے؟ کون کرے؟ اور کس طرح کرے؟ فارس کی حکومت کا چراغ خلیفہ ثانی کی حکومت میں گل ہوا۔ یزدجرد کو خود اس کی رعایا نے قتل کیا اور اس کے خاتمہ میں مسلم عساکر کی مدد کی۔ پھر سازش کی ضرورت کیسے ہوئی؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت میں بعض مشتبہ بیانات ملتے ہیں لیکن قاتل کو جس طرح سزا دی گئی اس میں کوئی سازش تصور نہیں کی گئی بلکہ ابولولوء کا ذاتی انتقام تصور کیا گیا۔

اگر کسی سازش کا خطرہ ہوتا تو عجمی حضرات پر مدینہ منورہ کے دروازے بند کر دیئے جاتے۔ بعض غیر معتدل اشخاص سے خطرہ کے باوجود مدینہ منورہ کے داخلہ پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی۔ شخصی رنجشوں سے بعض وقت قتل تک نوبت پہنچ جاتی ہے یہی چیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت میں کارفرما تھی۔ اور اگر اسے سازش تسلیم بھی کر لیا جائے تو وہ عام اور قومی نہ تھی بلکہ

ایک فارسی خاندان تک محدود تھی۔

فتح کے بعد

فارس کی فتح کے بعد ہزاروں فارسی اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے، جزیہ دیتے رہے، انہیں کسی نے بھی کچھ نہیں کہا۔ ان کے معبد (آتش کدے) مدتوں قائم رہے، جو لوگ ان سے اسلام کی طرف راغب ہوئے۔ انہیں اسلام نے پوری ہمدردی کے ساتھ اپنی آغوش میں عزت کی جگہ دی۔

جہاں مذہب یوں آزاد ہو اور سیاست اس طرح بے اثر، ملک کے عوام مسلمانوں کی فتوحات پر خوشیاں مناتے ہوں جب وہ جنگی مصالح کی بنا پر کسی مقام سے پیچھے ہٹنا پسند کریں تو اس علاقہ میں صفِ ماتم بچھ جائے۔

تعجب ہوتا ہے کہ ادارہ طلوعِ اسلام اور جناب اسلم جیراجپوری نے سازش کے جراثیم کو کونسی عینک سے دیکھ لیا......!

تاریخ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی عدل گستری اور انصاف پسندی کی وجہ سے فارس کے لوگ بالکل مطمئن ہو گئے۔ اس لیے انہوں نے سیاست کا میدان چھوڑ کر فاتحین کی علم دوستی کے اثرات سے فارس کے ذہین لوگ فوراً علم کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس راہ میں انہوں نے آخرت کی سربلندیوں کے علاوہ علمی دنیا میں بہت بڑا نام پیدا کیا اور حکومت کے خلاف سازش کا ان کی زبان پر کبھی نام تک نہیں آیا۔

یہ سازش کا پورا کیس مولانا جیراج پوری کے کاشانہ اور ادارۂ طلوعِ اسلام کے دفتر میں تیار ہوا۔ واقعات کی روشنی میں اسے ثابت کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ البتہ عباسی حکومت میں جب قلمدانِ وزارت برامکہ کے ہاتھ میں چلا گیا تو یونانی علوم کے تراجم سے اسلام کے سادہ عقائد کے خلاف ایک محاذ قائم ہوا لیکن اس وقت حدیث کے دفاتر منضبط ہو چکے تھے۔ خلیفہ ہارون ایسا آدمی حدیث کے متعلق مطمئن تھا۔ رہے یونانی علوم تو ان کا رد ائمہ سنت نے پوری جرأت سے کیا یہاں تک کہ وہ بے اثر ہو گئے اور ائمہ سنت کے حملوں کی تاب نہ لا سکے۔

سازش کا مضحکہ خیز پہلو

سازش کی یہ عجیب قسم ہے کہ سازشیوں نے فاتحین کا مذہب قبول کیا۔ پھر ان کے علوم کی اس قدر خدمت کی کہ فاتحین اپنے علوم کی حفاظت سے بے فکر اور کلی طور پر مطمئن ہو گئے۔ پھر فاتحین نے ان میں سے اکثر علوم اور علما کی سرپرستی کی۔

ابن خلدون فرماتے ہیں:

وَدَفَعُوْا ذٰلِکَ اِلٰی مَنْ قَامَ بِهٖ مِنَ الْعَجَمِ وَالْمُوَلَّدِیْنَ وَمَا زَالُوْا یَرَوْنَ لَهُمْ حَقَّ الْقِیَامِ بِهٖ فَاِنَّهٗ دِیْنُهُمْ وَعُلُوْمُهُمْ وَلَا یَحْتَقِرُوْنَ حَمَلَتَهَا کُلَّ الْاِحْتِقَارِ۔ [1]

''عرب بادشاہوں نے علوم کو ان لوگوں کے سپرد کر دیا جو ان کی پوری طرح حفاظت کر سکیں اور یہ لوگ سب عجمی اور موالی تھے اور یہ بادشاہ ان علما کے حقوق کا پورا احترام کرتے تھے اور ان کی خدمات کی قدر کرتے تھے اور قطعی طور پر ان کو حقیر نہیں سمجھتے تھے کیوں کہ وہ ان کے علوم اور دین کے محافظ تھے۔''

معلوم ہے کہ اموی خلفا کے وقت شاہی درباروں میں عجمیوں کو وہ اقتدار حاصل نہ تھا جو عباسی درباروں میں برامکہ کو حاصل ہوا لیکن ان کا دامن دین کی خدمات سے بالکل خالی تھا۔ قرآن وسنت اور دینی علوم تو بڑی بات ہے برامکہ سے تو عربی زبان کی بھی کوئی خدمت نہ ہو سکی۔

ہارون الرشید نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے درس کی سرپرستی کرنے کی کوشش کی لیکن امام نے اسے بے اعتنائی سے مسترد کر دیا۔ روپیہ دینے کی کوشش کی تو پورے استغناء سے واپس فرما دیا۔

سازش کا آخری مقصد ہو سکتا تھا کہ شاہی دربار تک رسائی ہو، مال و دولت اور حکومت میں حصہ ملے۔ اب دربار خود درِ دولت پر حاضر ہوتا ہے۔ اپنی ساری سربلندیاں چھوڑ کر پورے انکسار، انتہائی احترام سے خزانوں کے دروازے کھلتے ہیں، تھیلیاں باادب پیش ہوتی

---

[1] مقدمة ابن خلدون، الفصل الثالث والاربعون ۱/ ۶۳۰۔

ہیں اور ''سازشی'' ہیں کہ نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے۔

بادشاہ عرض کرتے ہیں کہ بغداد شریف لے چلیے آنکھیں فرشِ راہ ہوں گی۔ فارسی سازش کے سرغنہ یا فنِ حدیث کے سالارِ قافلہ فرماتے ہیں۔

وَالْمَدِيْنَةُ خَيْرٌ لَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ.

مطلب یہ کہ اس بڑے دربار سے علیحدگی میرے لیے ناممکن ہے۔

پھر سازشیوں کا یہ پورا گروہ مختلف عجمی ممالک سے ہزاروں میل سفر طے کر کے مدینہ منورہ پہنچ کر امام کی خدمت میں تحصیلِ علم کے لیے پیش ہوتا ہے اور کوئی نہیں سوچتا کہ ان کا شیخ عرب ہے اور یہ عجمی النسل لوگوں کی پوری سازش کا راز فاش نہ کر دے۔

عرب استاد کے عجمی شاگرد مدتوں استفادہ کرتے ہیں اور انہیں علوم کا درس دیا جاتا ہے۔ ساتھی ساتھی پر جرح کرتا ہے۔ ایک دوسرے کی کمزوریوں کے کھلے بندوں تذکرے ہوتے ہیں۔ عرب محدث، عجمی علما پر تنقید کرتے ہیں، عجمی، اہلِ عرب کے نقائص کی نشاندہی کرتے ہیں لیکن اس سازش کا سراغ جس کے اختراع کا سہرا ''طلوعِ اسلام'' کے دفتر کے سر ہے نہ کسی عرب کو لگا نہ کسی عجمی کو، نہ استاد نے اسے محسوس کیا نہ شاگرد نے نہ ساتھی نے......!

پھر تعجب بالائے تعجب یہ ہے کہ فارس کی فتح پہلی صدی کے اوائل میں ہوئی، اور سازش کا منصوبہ تیسری صدی میں بنایا گیا۔ تقریباً پورے دو سو سال بے وقوف اہلِ فارس آرام کی نیند سوتے رہے یعنی جب شکست کا درد اور کوفت تازہ تھی۔ اس وقت تو فارسیوں کو کوئی احساس نہ ہوا لیکن تین سو سال کے بعد درد کی بے قراریاں انگڑائیاں لینے لگیں اور فارسی سازشیوں نے بخاری، مسلم اور کتبِ صحاح کی صورت اختیار کر لی۔ (فَيَا لِلْعُقُوْلِ وَاَرْبَابِهَا.)

پھر اتنی بڑی سازش جس نے پوری اسلامی اور تعلیمی دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اسے کوئی نہ جان سکا۔ دنیا مسلم اور غیر مسلم مؤرخوں کی آنکھیں بے کار ہو گئیں۔ قلم ٹوٹ گئے اور زبانیں گنگ، ان کی ضخیم کتابیں اس عظیم الشان سازش کے تذکرہ سے یکسر خالی ہیں۔ یہ راز سب سے پہلے یورپ کے ملحد مستشرقین پر کھلا اور اس کے بعد دفتر طلوعِ اسلام کے دریوزہ گروں نے کچھ ہڈیاں مستعار لے لیں۔ ﴿فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا

يَكْسِبُوْنَ○﴾ ❶

عجمی سازش اور دینی علوم

فنِ حدیث کے طالب علم جانتے ہیں کہ فنِ حدیث کو آغاز ہی میں تین مراحل سے گزرنا پڑا' جمع و تدوین اور ترتیب حدیث۔ جمع اور حفظ کا سلسلہ تو آنحضرت ﷺ کی حیاتِ مقدسہ میں آپ ﷺ کے سامنے ہی شروع ہو گیا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے علمائے حدیث اور اس کی طلب میں سرگرداں ہونے والوں کے حق میں دعائیں فرمائیں۔

((رَحِمَ اللّٰهُ اِمْرَاءً سَمِعَ كَلَامِيْ فَوَعَاهَا ثُمَّ اَدَّاهَا كَمَا سَمِعَهَا.)) ❷

''اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے جس نے میری بات سن کر اسے یاد رکھا' پھر جس طرح سنا اسی طرح پہنچا دیا۔''

صحابہ باہم حدیث کا مذاکرہ اور دَور کرتے تھے۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

(تَذَاكَرُوا الْحَدِيْثَ فَاِنَّ الْحَدِيْثَ يَهِيْجُ الْحَدِيْثَ.) ❸

''حدیث کا باہم مذاکرہ کرو۔ باتوں سے باتیں یاد آجاتی ہیں۔''

ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

''حدیث کا باہم تذکرہ کرو تا کہ یہ بھول نہ جائے یہ قرآن کی طرح مجموعہ نہیں۔ اگر اس کا مذاکرہ نہ کیا گیا تو یہ بھول جائے گی اور یہ مذاکرہ ہر روز ہونا چاہیے۔'' ❹

ابنِ ابی لیلیٰ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

(تَذَاكَرُوْا فَاِنَّ اَحْيَاءَ الْحَدِيْثِ مُذَاكَرَتُهُ.) ❺

''حدیث کا دور کرو' حدیث کی زندگی دور مذاکرہ سے ہے۔''

علقمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

---

❶ ٢/البقرہ:٧٩۔ ❷ ابن ماجه' كتاب السنة' باب من بلغ علما رقم ٢٣٦؛ الترمذی' كتاب العلم باب ماجاء في الحث على تبليغ السماع ٢٦٥٨؛ مسند احمد' ٤/ ٨٠؛ مجمع الزوائد' ١/ ١٣٩۔

❸ الدارمی فی المقدمه' باب مذاكرة العلم :رقم ٦٠١ ـ ٦٠٢۔

❹ الدارمی فی المقدمه' باب مذاكره العلم رقم ٦٠٥۔

❺ الدارمی فی المقدمة' باب مذاكرة العلم رقم ٦٠٧۔

(تَذَاكَرُوا الْحَدِيْثَ فَإِنَّ ذِكْرَهُ حَيَاتُهُ.) ❶

''حدیث کے درس اور ذکر ہی میں اس کی زندگی ہے۔''

صحابہ رضی اللہ عنہم نمازِ عشا کے بعد درس اور مذاکرہ کے لیے بیٹھتے' یہاں تک کہ صبح کی اذان ہوجاتی۔ ❷ دارمی اور دوسری کتبِ حدیث میں اس قسم کے آثار کثرت سے موجود ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کے پاس احادیث کے لکھے ہوئے تذکرے اور مجموعے بھی موجود تھے۔ عبداللہ بن عمرؓ' عبداللہ بن عمر اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم (کتابت حدیث ص ۴۵ بحوالہ فتح الباری) کے صحیفوں کا ذکر کتبِ حدیث میں اکثر ملتا ہے۔ ❸

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں درس اور مذاکرہ ہوتا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اپنے اسباق قلمبند فرماتے تھے۔ ابو قبیل فرماتے ہیں:

سَمِعْتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عَمْرٍو قَالَ : بَيْنَمَا نَحْنُ حَوْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم نَكْتُبُ فَسُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اَیُّ الْمَدِيْنَتَيْنِ تُفْتَحُ اَوَّلًا قُسْطَنْطِنِيَّةُ اَوْ رُوْمِيَّةُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم :((لَا بَلْ مَدِيْنَةُ هِرَقْلَ)) ❹

''ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلقۂ درس میں بیٹھ کر لکھ رہے تھے۔ ایک آدمی نے سوال کیا کہ روما پہلے فتح ہوگا یا قسطنطنیہ؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہرقل کا شہر پہلے فتح ہوگا یعنی قسطنطنیہ۔''

اس اثر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا درسِ حدیث اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں اس کی کتابت کا تذکرہ واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اپنے اسباقِ حدیث یادداشت اور تذکرہ کے طور پر لکھا کرتے تھے۔

---

❶ الدارمی فی المقدمہ' باب مذاكرة العلم: رقم٦٠٨۔

❷ الدارمی فی المقدمہ' باب مذاكرة العلم: رقم٦١٦۔

❸ الدارمی فی المقدمة' باب من رخص فی كتابة العلم ١٣٢/١ تا ١٣٧۔ وکتابت حدیث از مولانا الحاج سید شاہ منت اللہ صاحب ص٢٩۔٣٠۔

❹ الدارمی فی المقدمہ' باب من رخص فی كتابة العلم رقم :٤٩٢ وکتابت حدیث من الحاج سید شاہ منت اللہ ص٣٤۔

جھوٹی حدیث اور وعید

آنحضرت ﷺ کی اس وعید کے بعد کہ جو آدمی دانستہ جھوٹی حدیث بیان کرے اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ [1] حدیث کی کتابت کے سوا چارہ ہی نہیں؟ معلوم ہے کہ یہ حدیث قرآن کی طرح متواتر ہے۔ اس حدیث کی موجودگی میں کتابتِ حدیث اور اس کے جواز اور عدم جواز کی بحث بالکل بے معنی ہے۔ اس کا قطعی مفہوم یہ ہے کہ حدیث ایک مُستند دستاویز ہے۔ شرعاً وہ حجت ہے' اس میں کسی جھوٹ اور آمیزش کے لیے کوئی گنجائش نہیں' اس حقیقت کے ہوتے ہوئے ضروری ہے کہ اس ذخیرہ کی حفاظت کے لیے ہر سامان کیا جائے' حفظ وضبط ہو یا کتابت اور تحریر بلکہ دونوں' کیوں کہ انفراداً دونوں میں غلطی اور سہو کے امکانات ہیں۔

اور اس کے لیے موزوں تر وقت آنحضرت ﷺ کی زندگی اور صحابہ کے جمِ غفیر کی موجودگی ہے ورنہ اس سامانِ حفاظت کی ضرورت ہی کیا تھی۔

سابقہ آثار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنی طبعی رفتار کے ساتھ یہ سلسلہ مختلف علاقوں میں جہاں اہلِ علم صحابہ رضی اللہ عنہم موجود تھے۔ پوری پہلی صدی میں جاری رہا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے ضخیم کتابیں بطور تذکرہ جمع فرمائیں جن کی طرف وہ بوقتِ ضرورت مراجعت فرماتے اور احادیث کی تصحیح فرماتے تاکہ آنحضرت ﷺ کی طرف کوئی غلط چیز منسوب نہ ہو جائے اس کی تفصیل سنت کے دفاتر میں اپنے اپنے مقام پر موجود ہے۔

دُوسری صدی

پہلی صدی کے اواخر میں اموی سلطنت کا چراغ گل ہو گیا اور اموی حکومت کا پھریرا ہمیشہ کے لیے سرنگوں ہو گیا چند سال ائمہ حدیث کی نقل وحرکت پر سیاسی خلفشار کی وجہ سے پابندی رہی اور علم کے یہ خزانے اپنے علاقوں تک محدود رہے' کوفہ' بصرہ' بغداد' خراسان' مکہ مکرمہ' مدینہ منورہ' نجد' یمن اور مصر وغیرہ مختلف علاقوں کے علما اپنے علاقوں میں درس حدیث

---

[1] **بخاری**' کتاب العلم: باب اثم من کذب علی النبی ﷺ۔ ۱۰۷؛ **مسلم**' کتاب الزھد باب الثبت فی الحدیث' ۷۵۱۰؛ **ابو داؤد**' کتاب العلم: باب التشدید فی الکذب علی رسول اللہ ۳۶۵۱؛ **ترمذی**' کتاب الفتن باب فی لزوم تقوی اللہ عند الفتح والنصر ۲۲۵۷؛ **ابن ماجہ**' کتاب السنۃ: باب التغلیظ فی تعمد الکذب علی رسول اللہ' ۳۰۔

بیٹے رہے۔ان علاقوں میں موجود صحابہ رضی اللہ عنہم اقامت پذیر تھے ان کے علوم اور دروس کی اشاعت اس علاقہ ہی میں ہوتی رہی اور حفظ و کتابتِ حدیث کا سلسلہ ان علاقوں میں اپنی بساط کے مطابق بدستور جاری رہا۔اموی' ہاشمی اور عباسی قسمت آزما پوری قوت سے نبرد آزما تھے اور اکھاڑ پچھاڑ کی تند و تیز ہوائیں پورے زور سے چل رہی تھیں اور یہ سازشی پورے سکون سے اپنے مدارس میں حدیث کے حفظ و جمع میں مشغول تھے۔اگر کسی سر پھرے بادشاہ کو کسی عالم پر بدگمانی ہوئی تو اسے اس نے جیل میں ڈال دیا۔جب ظلم نے اپنا نصاب پورا کر لیا۔قید کی مدت ختم ہوگئی تو جیل سے نکل کر اپنے مدرسہ میں آگئے اور علم و دین کی خدمت میں مشغول ہوگئے۔کوئی عملی قدم ان متحارب فریقوں کے موافق یا خلاف نہیں اٹھایا۔بدگمانیاں محض اظہارِ خیال یا رجحانِ طبع کی وجہ سے ہوئیں حالانکہ سازشیں ایسے ہی اوقات کی منتظر ہوتی ہیں۔دشمن پر حملہ کرنے کا بہترین وقت وہی ہوتا ہے جب دشمن دوسری طرف مشغول ہو۔حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق سیاسی دلچسپی کے بعض واقعات تاریخ کی زبان پر آتے ہیں لیکن ان میں فارس کا یہ عظیم الشان سازشی ہاشمی اور عربی حکومت کا حامی تھا۔آپ اس دور کی تاریخ پڑھ جائیے۔آپ کو اہلِ علم پر حکومت کی چیرہ دستیوں کے واقعات تو خال خال ملیں گے لیکن ان علما نے حکومت کے خلاف کوئی محاذ قائم کیا ہو۔اس سے تاریخ ساکت ہے۔سازش کی پوری مسل طلوعِ اسلام کے دفتر اور علامہ جیراج پوری کے دولت کدہ میں بنی اور وہیں دھری کی دھری رہ گئی اور شاید اس ساری تہمت تراشی کا پورا بوجھ یہی حضرات اپنے کندھوں پر اٹھا کر خدا کے سامنے حاضر ہوں گے۔﴿وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ﴾ [1]

دَورِ تدوین

تیسری صدی میں جب عباسی حکومت کے قدم جم گئے۔امویوں کے ساتھ ہاشمی بھی خلافت کی بساط سے غائب ہوگئے۔چند روز خلفشار کے بعد جب ملک میں امن قائم ہوا تو ائمہ حدیث پابرکاب ہوگئے۔انہوں نے زمین کی طنابیں کھینچ لیں' علم میں وطنی اور علاقائی تقسیم کو عملاً ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔سفر کے موجود اور ممکن وسائل کے ساتھ خراسان سے اقصائے مغرب تک ان علم کے بادشاہوں نے پرسکون حملے شروع کر دیئے اور علم کی منصفانہ

---

[1] ۲۶/الشعرآء:۲۲۷۔

تقسیم کے لیے میدان ہموار ہو گئے۔ محدثین کی علمی سخاوت نے مشرق و مغرب کے قلابے ملا دیئے۔

اس وقت جمع اور حفظ کا کام ختم ہو چکا تھا اور غیر مرتب تذکرے اہلِ علم کے مکاتب میں موجود تھے۔ طلبہ مسودات اور مبیضات کی تصحیح اور اصلاح کے بعد ان کی تدوین کی طرف متوجہ ہوئے۔ بعض کتابیں دوسری صدی میں بھی مدون ہوئیں۔ لیکن مہم کے طور پر تدوین کا کام تیسری صدی میں شروع ہوا۔ ائمہ حدیث نے فن کی تدوین مختلف طریقوں سے فرمائی۔ بعض نے مرفوع احادیث اور آثارِ صحابہ دونوں کو جمع کیا۔ بعض سے صرف مرفوع احادیث کی تدوین ہوئی۔ بعض نے مرفوع احادیث کے ساتھ فقہا کے مذاہب کا ذکر فرمایا۔ کسی نے اسانید اور رجال کا مفصل ذکر کیا۔ کسی نے یہ تذکرے بقدرِ ضرورت بیان فرمائے۔ تفصیل کی ضرورت نہیں سمجھی۔ بعض نے ہر صحابی کی مسند کو یکجا جمع کیا۔ ہر ایک کی مسانید کو قرینے سے یکجا کر دیا۔ بعض نے معجم کی صورت میں یہ ذخیرہ جمع فرمایا۔ کسی نے متن حدیث کا پہلا حرف بطور عنوان ذکر کیا۔ کسی نے رواۃ کے نام سے معجم مرتب فرمائی۔ کسی نے حدیث کے تمام ابواب اور مسائل کا ذکر کیا جس میں سیرت' آداب' مغازی' اشراط ساعت وغیرہ سب آ گئے جیسے بخاری اور ترمذی وغیرہ اور بعض نے صرف سنن پر کفایت فرمائی۔ اس میں عبادات' معاملات وغیرہ کی تفصیل آ گئی۔ کسی نے صرف صحیح احادیث جمع کیں۔ بعض نے صحیح و ضعیف کا ملا جلا ذخیرہ پیش فرمایا۔ بعض حضرات نے استدراک فرمایا۔ بعض نے صرف ایک مسلک کے ادلہ جمع کر دیئے غرض اس فن میں انتہائی خوشنما تنوع کے بکھرے ہوئے پھول جمع ہو گئے۔

ائمہ حدیث میں سے اکثر فقیہ تھے' مسائل کے استنباط پر انہیں پوری قدرت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں اجتہاد کی تمام شرائط جمع فرما دی تھیں۔ انہوں نے بہترین تبویب کے ساتھ اپنی تصانیف کو علم کی منڈی میں لا کر رکھ دیا۔

دورِ ترتیب

اس تدوین کے ساتھ ترتیب کا مرحلہ بھی لازمی تھا۔ وہ آج تک علما کی طبع آزمائی کے لیے ایک بہترین میدان ہے' اخلاق' اموال' مغازی' معاشیات' طب' ادعیہ اربعینیات خمسیات

اجزاوغیرہ کی صورت میں مجموعے مرتب ہوتے رہے پھر شروح حل لغات قواعد' تسوید رجال تمیز بین المختلطات' سند اجازت وجادہ' غرض مختلف انداز سے اُمّت نے اس فن کی خدمت کی۔ اس کے علوم کو مرتب فرمایا اور اسے پوری زندگی کا مشغلہ قرار دیا۔ یہ عجیب سازش تھی جو مقصد زندگی قرار پاگئی' راتوں کو نیند حرام ہوگئی۔ دنیا کے مشاغل سب طاقِ نسیاں کی زینت ہوگئے۔ نہ اچھے کھانے کی خواہش نہ بہتر مکان کی تلاش نہ بادشاہوں کے درباروں سے رابطہ۔

عرصہ ہوا امرتسر کے رسالہ بیان القرآن میں ان بیچاروں پر یہ بھی الزام لگایا گیا کہ محدثین نے درباروں کا مقاطعہ کر کے ملک کی خدمت کے بہترین مواقع ضائع کردیے۔

دراصل عیب چینی الزام تراشی سب سے سہل مشغلہ ہے۔ خصوصاً ان لوگوں پر جو صدیوں سے اللہ کو پیارے ہوچکے ہیں اور اعتراض بھی وہ لوگ کریں جن کی اپنی زندگیاں خداشناسی' خداترسی سے تقریباً ناآشنا ہیں۔ اعمال صالح' اتباع سُنّت اور ورع وتقویٰ سے یکسر خالی۔ یہاں کی سب سے بڑی دینی خدمت اور منتہائے علم کتابوں کی فروخت اور جھوٹ سچ کہہ کر اداروں کو چلانا اور حضرات امرا کو خوش کرنے کے سوا کچھ نہیں۔

ائمہ حدیث زندہ ہوتے تو ان معترضین کو عمر خیام کی زبان سے عرض کرتے۔

صاحب فتویٰ ز تو پر کارتریم　　بایں مستی از تو ہشیار تریم
توخونِ کساں بخوری ماخونِ رزاں　　انصاف بدہ کدام خونخوار تریم

ائمہ حدیث معصوم نہیں' جمع وتدوین وترتیب میں غلطی ہوسکتی ہے۔ وہ خود آپس میں تنقید واستدراک فرماتے ہوئے بڑے بڑے آدمی کی لغزش کو معاف نہیں فرماتے لیکن کسی سازش اور دیانت فروشی کا ادنیٰ احتمال بھی اس بارگاہ میں ممکن نہیں۔ ﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا﴾ [1]

مُشت بعد از جنگ

یہ سازش کی تہمت کا حربہ بڑی دیر کے بعد منکرینِ حدیث کے ذہن میں آیا۔ یہ مشت

[1] ۳۳/الاحزاب:۲۳۔

بعد از جنگ ہے۔ اس کا استعمال اپنے قرابت داروں پر ہونا چاہیے۔ جمع وتدوین کا سلسلہ تقریباً تیسری صدی کے آخر تک ختم ہو گیا۔ اب پورے ہزار سال بعد ان کے ہوش وحواس نے انگڑائی لی کہ محدثین تو سازش کر گئے۔ اور فنِ حدیث سازشیوں کی نذر ہو گیا۔ اب سوچئے کہ اتنی دیر کے بعد ایسے فوجداری مقدمات کی تفتیش ممکن ہے یا کوئی دانشمند اس موضوع پر سوچنے کی بھی کوشش کر سکتا ہے؟ اور پھر یہ تفتیش کسی نتیجہ پر بھی پہنچ سکتی ہے؟ مثلاً قرآن عزیز نے آج سے کئی ہزار سال پیشتر کا ایک کیس ذکر فرمایا ہے۔ ملکہ مصر نے محبت کی سرشاریوں میں اپنے غلام کو بلا کر محل کے تمام دروازے بند کر دیئے اور غلام سے کھلے طور پر کہا کہ جنسی محبت کی آخری حدوں تک کامیاب رسائی کے لیے میرا دل بے قرار ہے اور اس سے انکار اور گریز کے متعلق کوئی عذر نہیں سنا جا سکتا۔ پاکباز غلام نے ملکہ کا ہاتھ جھٹک دیا اور بڑی جرأت سے کہا کہ دروازوں کی بندش کا کوئی سوال نہیں۔ میرے رب کی دوربین نگاہ اس محل کے گوشہ گوشہ پر محیط اور ذرے ذرے میں ساری ہے۔ اس کے ساتھ ہی اپنے آقا کی ناشکری یا نمک حرامی میرے لیے کیسے ممکن ہے۔ غلام دروازے کی طرف بھاگ نکلا ملکہ اس کے تعاقب میں دوڑی۔ اس دوڑ میں غلام کی قمیص پچھلی طرف سے پھٹ گئی۔ جب مکان کے صحن میں پہنچے تو ملکہ کے خاوند اور غلام کے آقا وہاں بذاتِ خود موجود تھے۔ ملکہ نے غلام پر الزام لگایا کہ چھیڑ کی ابتدا غلام نے کی ہے اسے جیل کی ہوا چکھانا چاہیے۔ عزیز مصر حقیقتِ حال دریافت ہی کر رہے تھے کہ فیصلہ کی ایک صورت سامنے آ گئی۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ مسئلہ چنداں مشکل نہیں۔ اگر ابتداءً شرارت غلام کی ہے تو اس کا رُخ ملکہ کی طرف ہونا ضروری ہے غلام کے کپڑے اگر سامنے کی طرف سے پھٹے ہیں تو ملکہ کی بات درست ہے سزا غلام کو ملنی چاہیے۔ اگر غلام کے کپڑے پشت کی طرف سے پھٹے ہیں تو معاملہ ظاہر ہے کہ بھاگتے ہوئے غلام کا تعاقب ملکہ نے کیا ہے اس لیے غلام سچا ہے ملکہ کی اس غلط جرأت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ غلام میں کوئی غلطی نہیں۔ [1]

جب معاملہ کی تحقیق کی گئی تو غلام سچا نکلا کیوں کہ غلام کی قمیص پشت کی طرف سے پھٹی ہوئی تھی۔ یہ جھگڑا آج سے کئی سو سال قبل پیدا ہوا اور اس وقت کی سوسائٹی کے عدالتی معیار کے

[1] ۱۲/یوسف: ۲۳۔۲۹۔

مطابق معاملہ طے ہوگیا اور حضرت یوسف علیہ السلام باعزت بری ہو گئے۔

اب آج کا عدالتی نظام آج کے عیارانہ اذہان اور فنِ وکالت کی موشگافیوں کی مدد سے اسے سوچتا ہے تو وہ یہ کہنے کی جرأت کرتا ہے کہ ملکہ کو خواہ مخواہ بدنام کیا گیا عورت ذات اور پھر ملکہ اور آج سے کئی سو سال پہلے کا ذہن کیسے عقل باور کر سکتی ہے۔ کہ ملکہ اپنے ادنیٰ غلام کے گریبان میں ہاتھ ڈال دے' اور اس کے پیچھے بھاگنا شروع کر دے۔ عقل اسے قبول نہیں کر سکتی۔ غلام ہزار خوبصورت سہی کیا ملکہ اپنے مقام کو نہیں سمجھتی تھی۔ وہ اس کے پیچھے کیسے بھاگ کھڑی ہوئی۔ یہ پوری داستان اصُولِ درایت کے خلاف ہے۔ بے شک قرآن نے اس روایت کی توثیق فرمادی ہے۔ لیکن درایت کو کیسے نظرانداز کیا جائے۔

ممکن ہے غلام کی قمیض اس حادثے سے پہلے ہی اتفاقاً پھٹ گئی ہو۔ بچوں کی بھاگ دوڑ میں غلام کا کرتا پہلے ہی کہیں شگاف آلود ہو گیا ہو۔ شاہد کی ہمدردیاں غلام کے ساتھ ہوں یا اتفاقاً معاملہ ہی اس نہج پر آ گیا ہو۔ اس وقت عدالت نے چونکہ اس احتمال اور امکان پر غور نہیں کیا۔ اس لیے یوسف علیہ السلام کی برأت مشکوک اور امرأۃ العزیز کا جُرم یا مصر کی عدالت کا فیصلہ نظر ثانی کے لیے پھر قانونی عدالت میں آنا چاہیے۔ اس کے علاوہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک طاقتور نوجوان پوری قوت سے بھاگ رہا ہو تو ایک عورت اس تیزی سے دوڑے کہ نوجوان کا دامن چاک کر دے۔ ممکن نہیں ہے کہ عورت اس تیزی سے دوڑ سکے۔ عورت کے بدن کی ساخت اور جسم کے مختلف اجزاء کی ہیئت کذائی کا تقاضا ہے کہ وہ جوانمرد کو نہ پکڑ سکتی ہے نہ اس کے پیچھے اس طرح دوڑ سکتی ہے۔ مصر کی عدالت کا فیصلہ محض جذباتی ہے۔ اس کی اپیل ہونی چاہیے۔ ممکن ہے ملکہ کا الزام غلام پر درست ہو۔ اور درایت کی رو سے ملکہ مصر بری نکلے۔

اس قسم کی اور بھی کئی تنقیحات امکان اور احتمال کی مشین کے ذریعے سے فن کار اور ماہر وکیل پیدا کر سکتے ہیں اور درایت کے عاشق درایت کی ریتی سے واقعات کا برادہ کر کے دے سکتے ہیں۔

اس ساری وکالت پروری کا جواب ایک سادہ دل اور دیانتدار انسان تو یہی دے گا کہ جس ماحول میں جرم ہوا' اس ماحول کی عدالت نے مناسب تحقیق کے بعد جو فیصلہ کیا وہی

درست ہے۔

میں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے شاہد کی از روئے حدیث پوزیشن کو عمداً نظر انداز کیا ہے اس لیے کہ ہمارے فریق مخالف اسے مانتے ہی نہیں اور یہاں تو وہ بظاہر قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن نے تو شاہد اسی کو کہا ہے جس میں شہادت کی فقہی شروط پائی جائیں اور ان حضرات کی بارگاہ میں معجزہ اور کرامت کو کوئی اہمیت حاصل نہیں!

قرآن عزیز میں اور بھی ایسے واقعات ہیں جن پر بحث کی گنجائش ہے اور آج کا قانونی مزاج اس پر مطمئن نہیں ہوسکتا۔ اس دور کے قانون پیشہ اور جج یقیناً محسوس کریں گے۔ کہ ان پر مرافعہ اور نظر ثانی کی کافی گنجائش ہے۔ امکان اور درایت کے ہتھیاروں سے قرآن پر بھی حملہ کیا جاسکتا ہے جو اہلِ قرآن کا اصل مقصد ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس بھیڑوں کا کیس پیش ہوا تو حضرت نے ڈگری ایک بھیڑ والے کے حق میں دی اور نوے بھیڑوں والے کے خلاف فیصلہ صادر فرمایا اور مدعا علیہ کا بیان تک نہیں سنا۔ استغاثہ کی کہانی سن کر مستغیث کو ڈگری دے دی۔ [1] ممکن ہے ایک بکری کا مالک ایک کی صحیح نگہداشت ہی نہ کرسکتا ہو۔ مدعا علیہ کا خیال ہوگا کہ وہ ریوڑ میں آکر زیادہ اور بہتر طور پر پرورش پاسکے گی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کا اس کے خلاف بغاوت اور ظلم کا فیصلہ آج کے عدالتی ماحول میں یقیناً مرافعہ کا مستحق ہے اور درایۃً محلِ نظر۔

سورۂ نون میں باغ والوں کا قصہ مذکور ہے جو بیچارے سوالیوں کی بھیڑ اور اپنے باغ کی حفاظت اور فائدہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا شکار ہوئے حالانکہ ان کا کوئی جرم نہیں۔ باغ ان کو باپ کی وراثت میں ملا۔ مسکین کو دینا شرعاً مالک کی مرضی ہے۔ پھر اس میں مستحق اور غیر مستحق کی بحث بھی آجاتی ہے لیکن ناراضگی میں ان بے چاروں کا باغ برباد کردیا گیا اور وارننگ تک نہیں دی گئی [2] بے شک یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے لیکن جب عقل وشعور کی فوجیں انسانی حقوق اور عدل وانصاف کی حمایت کے لیے میدان میں آجائیں تو وہاں حقائق کو کھل کر سامنے آنا چاہیے۔ اللہ اور رسول کے نام سے ایسے موقع پر اپیل نہیں کی جاسکتی۔

---

[1] ۳۸/صٓ: ۲۲۔۲۴۔ [2] ٦٨/القلم: ١٧۔٣٣۔

عقل وشعور کے مفتی کو بہرحال اپنا فتویٰ صادر کرنے کا حق ہے۔ اس کا اثر خُدا پر پڑے یا اس کے رسول پر۔ آخر انسانی حقوق اور عدل وانصاف کے تقاضے بھی تو انہیں کے بنائے ہوئے اور بتائے ہوئے ہیں۔ پھر وہ کیوں اس کی پابندی نہ کریں اور عقل ودرایت کی تنقید سے وہ کیوں بچیں۔ اصُول سب کے لیے اصُول ہے۔

عقل اور احتمالات کے گھوڑے اگر اسی طرح سرپٹ دوڑانا شروع کردیں جس طرح سُنّت اور حدیث کے خلاف ان کی لگامیں ڈھیلی کردی گئی ہیں تو ان کی یورش سے نہ خُدا بچے گا نہ رسول، نہ کوئی حقیقت محفوظ رہے گی نہ کوئی اصُول۔

خود بے چارے ابلیس کا کیس اسی نوعیت کا تھا۔ معمولی سی عقل ودرایت کی گرفت سے ہمیشہ کے لیے مطرود اور جلاوطن کردیا گیا ہے۔ اپیل کے لیے بھی اسے کوئی موقع نہیں دیا گیا۔

سازش کہاں کہاں؟

اب سازش کے ان مریضوں سے گزارش ہے کہ آپ کا کیس خراب ہو چکا۔ آپ کو آج سے چند صدیاں پہلے ہونا چاہیے تھا۔ پھر ضروری تھا کہ کسی پولیس کے ہمرنگ محکمہ میں ملازمت کرتے اور ایسے انداز کے آفیسر آپ کو مل جاتے تو ممکن تھا کہ آپ کا کیس کمزور بھی ہوتا تو فیصلہ آپ کے حق میں ہو جاتا۔ یورپین مکتشفین کی شہادتیں آپ کے حق میں ہوتیں۔ آپ کو سازش اس وقت سوجھی جب اس کا وقت گزر چکا۔ فن کی تکمیل اور ملزموں کی موت پر صدیاں گزر چکیں۔ آپ نے تیرہ صدیوں کے بعد صرف حدیث کے متعلق سازش کا احساس کیا۔ مگر سازش ساری علمی دنیا میں اپنا جال بچھا چکی ہے۔ قرآن مجید کا تواتر لفظی جس پر آپ حضرات اترا رہے ہیں وہ بھی عجمی اثرات سے محفوظ نہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ قرآن کے معنیٰ اور مفہوم تو متواتر نہیں، الفاظ متواتر ہیں، اختلافِ قرأت کے باوجود قرآن متواتر ہے۔ یہ قرأت اور فنِ تجوید ہم تک قراء سبعہ کی معرفت پہنچا اور ان کی اکثریت عجمی ہے۔ دیکھا آپ نے کہ جس تواتر پر آپ کو ناز ہے اس کی کلید عجمیوں کے ہاتھ میں ہے۔

قراء سبعہ

① عبداللہ بن کثیر مکی سنہ ۱۲۰ھ
② نافع بن عبدالرحمان مدنی سنہ ۱۶۹ھ
③ عبداللہ بن یزید بن تمیم ابن عامر سنہ ۱۱۸ھ
④ ابوعمرو بن علاء المقری البصری سنہ ۱۵۴ھ
⑤ عاصم بن ابی النجود الکوفی سنہ ۱۳۷ھ
⑥ حمزہ بن جیب بن عمارہ سنہ ۱۵۸ھ
⑦ ابوالحسن علی بن الکسائی سنہ ۱۲۹ھ

ان سات حضرات میں سے صرف دو عرب ہیں۔ ابن عامر اور ابوعمرو۔ (**ولیس فی ھؤلاء السبعة من العرب الاابن عامر او ابو عمرو**) [الجواہر المضیۃ ج ۲ ص ۴۲۳]

عربی زبان کی امامت بھی عجمیوں کے سپرد ہوگئی۔ ابن خلدون فرماتے ہیں۔

(**فَكَانَ صَاحِبُ صِنَاعَةِ النَّحْوِ سِيْبَوَيْهِ وَالْفَارِسِيَّ مِنْ بَعْدِهِ بَعْدَهُ وَالزَّجَاجَ مِنْ بَعْدِهِمَا وَكُلُّهُمْ عَجَمٌ فِي اَنْسَابِهِمْ**) ❶

''سیبویہ ابوعلی فارسی اور ان کے بعد زجاج یہ نسباً عجمی ہیں۔'' اور سنیے:

(**وَكَانَ عُلَمَاءُ اُصُوْلِ الْفِقْهِ كُلُّهُمْ عَجَمًا**) ❷

''علما اصول فقہ سب عجمی تھے۔'' اور سنیے:

(**وَكَذَا حَمَلَةُ عِلْمِ الْكَلَامِ وَكَذَا اَكْثَرُ الْمُفَسِّرِيْنَ وَلَمْ يَقُمْ بِحِفْظِ الْعِلْمِ وَتَدْوِيْنِهِ اِلَّا الْاَعَاجِمُ**) ❸

''متکلمین عجمی ہیں، مفسرین کی اکثریت عجمی ہے۔''

غرض دینی علوم کی حفاظت کی ذمہ داری تمام تر عجمی علما پر آ گئی اور آپ خرگوش کی نیند

---

❶ مقدمة تاريخ ابن خلدون، ۶۲۹/۱ الفصل الثالث والاربعون فی انه حملة العلم فی الاسلام اكثرهم العجم۔

❷ مقدمة تاريخ ابن خلدون، ۶۳۰/۱ الفصل الثالث والاربعون فی ان حمله العلم فی الاسلام اكثرهم العجم۔

❸ مقدمه ابن خلدون، ۶۳۰/۱ الفصل الثالث والاربعون فی ان حمله العلم فی الاسلام اكثرهم العجم۔

سوتے رہے۔

دیکھئے! آپ صرف حدیث میں عجمی سازش سمجھ رہے ہیں۔ آپ کی پوری علمی جائداد پر عجمی قبضہ ہے۔ افسوس ہے آپ کو اس سازش کا اس وقت علم ہوا جب آپ پورے طور پر لٹ چکے تھے اور عجمیوں نے صدیوں سے سارے علوم کے دروبست پر قبضہ کرلیا۔ لیکن آپ کو یورپ کے مکتشفین نے صرف حدیث کے متعلق بتایا۔ آپ نے لاعلمی کی وجہ سے اسے بہت بڑا اکتشاف سمجھا۔ حالانکہ یہ صرف لاعلمی کی ستم ظریفیاں ہیں اور بس!

علم اور جہالت میں فرق

ابنِ خلدون یورپ کے مؤرخین میں مسلمہ امام ہیں۔ تاریخ کی جدید تدوین ان کی رہینِ منت ہے۔ یہ خود اُندلس کے رہنے والے اور عجمی ہیں لیکن وہ عالم ہیں۔ علوم کی تدوین اور ان کے تدریجی ارتقا کی پوری تاریخ ان کی نظر میں ہے۔ وہ اس حقیقت کی علمی تحقیق فرماتے ہیں کہ دینی علوم پر عجمیوں نے کیسے قبضہ کیا اور کیوں؟

(وَمِنَ الْغَرِيْبِ الْوَاقِعِ اَنَّ حَمَلَةَ الْعِلْمِ فِي الْمِلَّةِ الْإِسْلَامِيَّةِ اَكْثَرُهُمُ الْعَجَمُ وَلَا مِنَ الْعُلُوْمِ الشَّرْعِيَّةِ وَلَا مِنَ الْعُلُوْمِ الْعَقْلِيَّةِ إِلَّا الْقَلِيْلُ النَّادِرُ وَاِنْ كَانَ مِنْهُمُ الْعَرَبِيُّ فِيْ نِسْبَتِهٖ فَهُوَ عَجَمِيٌّ فِيْ لُغَتِهٖ وَمَرْبَاهُ وَمَشْيَخَتِهٖ مَعَ اَنَّ الْمِلَّةَ عَرَبِيَّةٌ وَصَاحِبُ شَرِيْعَتِهَا عَرَبِيٌّ.) [1]

''یہ عجیب واقعہ ہے کہ علمائے اسلام اکثر عجمی ہیں۔ شرعی اور عقلی علوم میں عرب قلیل اور نادر ہیں۔ اگر ان میں کوئی نسبت کے لحاظ سے عربی ہے تو لغت تربیت اور شیوخ کے لحاظ سے عجمی ہے حالانکہ ملتِ عربی ہے اور نبی بھی عربی۔''

اس کا سبب یہ ہے کہ اسلام میں ابتداءً سادگی تھی۔ اس میں علم اور صنعت نہ تھی۔ بدوی سادگی کا یہی تقاضا تھا۔ دین کے اوامر اور نواہی نقلاً حافظوں میں موجود تھے۔ وہ ان کے ماخذ کو کتاب وسُنّت سے جانتے تھے۔ انہیں تعلیم وتالیف اور تدوین کی ضرورت نہ تھی۔ یہ طبعی اور

[1] مقدمه ابن خلدون' الفصل الثالث والاربعون: ۱/۶۲۸ فی ان حمله العلم اکثرهم العجم۔

قدرتی روش صحابہ اور تابعین کے زمانہ تک قائم رہی۔ اس قسم کے اہل علم کو وہ اپنے عرف میں قراء کہتے تھے اسی طرح قرآن وسنت کے حافظوں کو بھی وہ قاری ہی کے نام سے تعبیر کرتے تھے۔ اس لیے کہ وہ قرآنِ عزیز اور سننِ نبویہ ماثورہ سے مسائل کو سمجھتے تھے اور معلوم ہے کہ حدیث قرآن کی تفسیر ہی تو ہے۔

جب حفظ ونقل کا زمانہ دُور ہوتا گیا تو عباسی دور اور ہارون الرشید کی حکومت میں قرآن مجید کے لیے تفاسیر اور احادیث کو قیدِ تحریر میں لانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی اسانیدِ رجال اور علومِ جرح وتعدیل کی ضرورت ابھر آئی تاکہ احادیث کے ضعف اور صحت پر بحث کی جاسکے۔ پھر احکام کے استنباط واستخراج اور زبان کو بگاڑ سے بچانے کے قواعد بنائے گئے۔ یعنی صرف ونحو، معانی بیان وغیرہ علوم عربیہ کی بنیاد رکھی گئی۔ اس طرح ان تمام علوم نے فن اور حرفت کی صورت اختیار کرلی۔ عرب حکومت کی مشغولیت اور موروثی سادگی کی وجہ سے پیشہ وری اور صنعت وحرفت سے نفرت کرتے تھے عجمی اہلِ علم چونکہ شہرت کے عادی تھے۔ ان کے ہاں صنعت وحرفت ایک اعزاز تھا۔ اسی لیے طبعی رجحانات کی وجہ سے تمام علوم کی سرپرستی عجمیوں کے سپرد ہوگئی اور اپنی مخلصانہ محنت اور جانفشانی کے بل بوتے پر وہ اسی اعزاز کے اہل قرار پائے۔ [1]

نہ اس میں کوئی سازش تھی نہ دھوکہ بلکہ قدرتی تقسیمِ کار تھی جو خود بخود ہوگئی۔ خدا کی قدرت ہے کہ پوری بارہ صدیوں میں اکابر اور فحول اہلِ علم اس عجم خولیا سے محفوظ رہے۔ تیرھویں صدی کے اواخر میں یہ تکلیف سیکرٹریٹ کے چند پنشنر کلرکوں کو ہوئی جس کا اثر عوام پر بھی ہوا۔ اللہ تعالیٰ سب کو صحت عطا فرمائے اور عقل ودیانت سے سوچنے کی توفیق دے۔

سازش کے اثرات

عقلمند آدمی کے لیے ضروری ہے کہ اپنا معاملہ ہر پہلو سے سوچے اور خطرے کے ہر گوشہ کو کھلی نظر سے دیکھے۔ فارسی سازش کا کھٹکا ہمیں صرف اس لیے ہوا کہ ہم نے فارس کو فتح کیا۔ فارسی حکومت اس کے بعد صفحۂ ہستی سے ناپید ہوگئی۔ ہم نے آج کے حالات میں دیکھا

---

[1] مقدمہ ابن خلدون، الفصل الثالث والاربعون: ۱/ ۶۲۸ تا ۶۲۹ فی ان حملة العلم اکثرهم العجم۔

کہ مغربی حکومتیں باہم سازش کرتی ہیں۔ انتداب کے بہانہ سے چھوٹی حکومتوں کو دبا لیتی ہیں اور فنی امداد کے بہانے کمزور حکومتوں میں سازشوں کے جال بچھا دیتی ہیں۔ کچھ امداد دے کر بعض اوقات لوگوں کے ایمان تک خریدتی ہیں۔ آہستہ آہستہ چھوٹے ملک ان کے سہارے پر جینے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ آپ نے یہ سمجھا کہ خلیفہ ثانی نے جب فارسی شہنشاہیت کو تاراج کیا تو فارسیوں نے عربوں کے خلاف ضرور کوئی سازش کی ہوگی۔ یہ استدلال بظاہر واقعات پر مبنی معلوم ہوتا ہے اس لیے تھوڑی دیر کے لیے ذہن کو اپنی طرف پھیر لیتا ہے اور عام آدمی جس کی نظر اپنی اور عام قومی تاریخ پر نہ ہو اس سے ٹھوکر کھا سکتا ہے لیکن آپ تھوڑی سی گہرائی میں جائیں تو آپ یقین کریں گے کہ اس استدلال میں بہت کافی خلا ہے جس نے دلیل کو قطعی بے کار کر دیا ہے۔

① اس وقت کی حکومتوں کو آج کل کی حکومتوں کے مزاج پر قیاس کرنا درست نہیں۔ آج کی حکومتوں کے مزاج میں جمہوریت کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ شخصی حکومتیں اور ملوکیتیں بھی اس امتزاج سے خالی تھیں۔ اس لحاظ سے پوری دنیا کا مزاج بدل چکا ہے۔ استبداد کافی حد تک ختم ہو چکا ہے اس لیے اس وقت کی شخصی بادشاہتوں کو آج کی جمہوری حکومتوں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

② اس وقت کے مستبد بادشاہ اپنے قریبی اعزہ اور اقارب کو بھی عموماً دشمن بنا لیتے تھے۔ ملوکیت کی پوری تاریخ اس قسم کے حوادثات سے بھری پڑی ہے۔ بھائی نے بھائی کو قتل کرا دیا۔ بیٹے نے باپ کے خون سے ہاتھ رنگ لیے۔ ایسے لوگوں کے لیے عصبیت اور ان کی حمایت میں سازشیں اور بغاوت کون کرے۔

③ یہ درست ہے کہ مروان الحمار کی حکومت کے خلاف بغاوت کے لیے خراسان کو مرکزی حیثیت حاصل ہوئی اس لیے نہیں کہ اس میں فارسی عنصر زیادہ تھا۔ اس بغاوت کے سرغنہ تو عرب ہی تھے یعنی ہاشمی اور عباسی اہلِ بیت کی حمایت کے بہانہ سے یہ لوگ وہاں سازشیں کر رہے تھے۔ ان میں فارس کے شاہی خاندان کے فارسی ہمدردوں کا تاریخ میں کوئی پتہ نہیں چلتا ہے۔ بغاوت کے لیے یہ مقام اس لیے انتخاب کیا گیا کہ یہ پایۂ تخت یعنی شام سے کافی دُور

تھا۔ اطلاعات پہنچنے میں دیر ہوتی اور سرکوبی کے انتظامات کی وہاں تک رسائی کافی مشکل ہوتی۔ یہ حادثہ حدیث کے معاملہ میں فارسی سازش کے لیے دلیل نہیں بن سکتا۔

④ پھر آپ نے کبھی اس چیز پر بھی غور فرمایا کہ سرزمینِ حجاز سے شروع ہوکر اسلامی حکومت اقطارِ عالم تک لاکھوں مربع میل زمین پر پھیلی ہوئی تھی۔ آپ یہ سوچیں، آپ کو صلح سے کوئی ملک ملا۔ خود سرزمینِ حجاز میں قدم قدم پر لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ مکہ پر فوج کشی کی ضرورت ہوئی۔ نجد لڑائی سے ملا۔ شام عراق، حبش، یمن کے بعض علاقوں پر لڑنا پڑا۔ سمندر کے ساحلی علاقوں پر جنگیں ہوئیں۔

آنحضرت ﷺ کو اپنی زندگی میں کم وبیش بیاسی جنگیں لڑنا پڑیں۔ پھر یہ جنگوں کا سلسلہ خلیفہ ثالث کی حکومت کے درمیانی ایام تک جاری رہا۔ پھر خلیفہ ثالث کے آخری دور سے شروع ہوکر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حکومت کا پورا زمانہ قریب قریب باہمی آویزش کی نذر رہا۔ ۴۱ھ کے بعد جوں ہی ملک میں امن قائم ہوا خلفائے بن اُمیہ نے شخصی کمزوریوں کے باوجود جہاد فی سبیل اللہ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ہندوستان، اندلس، بربر، الجزائر تمام علاقے جنگ ہی سے اسلامی قلم رو میں شامل ہوئے۔ پھر آپ کے قلم اور دماغ نے سازش کا نزلہ صرف فارس پر کیوں گرایا؟ اگر محض ملک گیری اور فتوحات کی بنا پر بغاوتیں، سازشیں تصنیف کی جاسکتی ہیں تو حجازی سازش، ہندوستانی سازش، بربری اور اندلسی سازش کیوں نہیں بنائی گئی؟ کیا شام کے یہودی معصوم تھے؟ عراق اور روم کے مشرک اور عیسائی فارسیوں سے زیادہ پاک باز تھے؟ ان کی حکومتیں مسلمانوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ نہیں اتریں؟ مصر میں اسلامی فتوحات سے قبطی اور مصری قوموں کا وقار پامال نہیں ہوا؟ پھر آپ مصری سازش کے متعلق کیوں نہیں سوچتے؟

اگر عقل کا دیوالہ نہیں دے دیا گیا تو اپنی فتوحات کی پوری تاریخ پر غور فرمائیے۔ چین کے سوا شاید ہی کوئی ملک ہے جہاں مسلمانوں کے خون نے زمین کو لالہ زار نہ کیا ہو۔ مغربی سمندر کے سواحل پر آپ کی فوجیں برسوں لنگر انداز رہیں ان لوگوں پر آپ کو سازش کا شبہ کیوں نہیں۔ آپ الٹا خود ہی ان کی سازش کا شکار ہوگئے؟

غرر ن' ابنِ مکرم' ابن عربی' ابن العربی شاطبی' ابنِ حزم' یحیٰ بن یحیٰ' مسعودی وغیرھم قرطبہ اور اندلس کے علما کو کیوں سازشی نہیں کہا جاتا۔ اگر خراسان' بخارا' قزوین' ترمذ' نساء کے علما پر حدیث کے سلسلہ میں سازشی ہونے کی تہمت اس لیے لگائی گئی ہے کہ ان بزرگوں نے سنت کے پرانے تذکروں' صحابہ اور تابعین کی بیاضوں اور سلفِ امت کے مسودات سے تدوینِ حدیث کے لیے راہیں ہموار کیں تو علمائے اندلس نے بھی سنت کی کچھ کم خدمت نہیں کی۔ شروحِ حدیث' فقہ الحدیث اور علوم سُنّت کی خدمت میں اب بزرگوں نے لاکھوں صفحات لکھ ڈالے۔ ان خدمات کو کیوں سازش نہیں کہا گیا۔ منکرینِ سُنّت کے پورے خاندان میں کوئی عقلمند نہیں جو ان حقائق پر سنجیدگی سے غور کرے۔ کیا علوم دینی اور فنونِ نبوت کی ساری داستان میں آپ کو صرف علمائے فارس ہی مجرم نظر آئے۔

مَنْ كَانَ هٰذَا الْقَدْرُ مَبْلَغُ عِلْمِهِ

فَلْيَسْتَتِرْ بِالصَّمْتِ وَالْكِتْمَانِ

فارسی سازش کے متعلق گزارشات میں کسی قدر تفصیل سے عرض کرنا پڑا۔ اس لیے کہ عوام کے ذہن اس تہمت سے متاثر ہیں۔ بعض پڑھے لکھے لوگوں میں بھی اس تہمت کی وجہ سے تذبذب پایا گیا ہے۔ دین کا علم رکھنے والوں اور اپنی علمی تاریخ سے واقف حضرات کے ذہن پر اس کا گو کوئی اثر نہ تھا' رجال اور ان کی تاریخ سے تھوڑے بہت واقف کو بھی اس پر شک نہیں گزرتا لیکن رنج ضرور ہوتا ہے۔ کیوں کہ یہ ان لوگوں پر تہمت ہے جو دینی علوم کے ستون ہیں۔ دینی اور شرعی علوم کے آسمان ان ہی اقطاب پر گردش کرتے ہیں۔ اگر یہ لوگ سازشی ثابت ہو جائیں تو اسلام کی پوری عمارت زمین بوس ہو جائے گی۔

فرض کیجئے اگر امام ابوحنیفہ' امام شافعی' امام مالک' امام احمد بن حنبل' امام بخاری' امام مسلم بن الحجاج' امام ابوعیسیٰ الترمذی رحمۃ اللہ علیہم ایسے بزرگ اسلام کے خلاف سازش کرنے لگیں تو فقہ اور حدیث دونوں مشتبہ اور ناقابلِ اعتماد قرار پائیں گے۔

پھر اگر یہ سلسلہ اس طرح بڑھتا چلا جائے تو صرف ونحو' معانی' بیان' اصول' کلام' سارے علوم مشکوک ہو جائیں گے۔ تیرہ سو سال کی محنت جو عرب اور عجم سب نے مل کر کی ساری غارت

ہوجائے گی بلکہ پوری اُمّت کو کم فہم اور عقل فراموش تسلیم کرنا ہوگا جو ساری عمر اس شرانگیز شرارت کو معلوم نہ کر سکے۔ یہ تو بلاہت کی انتہا ہوگی۔

پھر ان ناقلینِ آثار میں امام شافعی مطلبی اور امام مالک، امام احمد بن حنبل، ابوعبید قاسم بن سلام رحمۃ اللہ علیہم ایسے خالص عرب بھی شامل ہیں، نیز ہر دور میں کتاب وسُنّت اور دینی علوم، ہم عجمیوں کی سازش کا شکار ہو چکے ہیں۔ یہ اُمّت پر مضحکہ خیز پھبتی ہوگی۔ خصوصاً جب یہ معلوم ہو کہ صدیوں کے بعد چند بے علم یا محدود العلم کلرکوں نے اس سازش کا سراغ لگالیا۔ دنیا کے دانشمندا کابر امت کے اس تساہل پر تعجب کریں گے اور ہنسیں گے۔

حالانکہ اس میں لاعلمی اور عجائب پسندی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ امید ہے کہ احباب ان مختصر گزارشات پر غور کریں گے۔

تحریکِ انکارِ حدیث کی رفتار

مولوی عبداللہ صاحب سے مولوی محمد رمضان اور مولوی حشمت علی صاحب تک اس تحریک کے سوچنے کا انداز یہ رہا کہ گویا اس ساری تحریک کے پیش نظر ایک مکان کی آبادی تھی جس کا مالک اور منتظم شیخ چٹو ہے۔ مولوی عبداللہ وغیرہ بحیثیت مولوی وہاں رہتے ہیں۔ کچھ لکھتے ہیں کچھ بچوں کو پڑھاتے ہیں۔ ان کے نزدیک اسلام کے تقاضے صرف اسی قدر ہیں، شیخ چٹو ناراض نہ ہوں اور مولوی عبداللہ کچھ لکھتے پڑھتے رہیں، عوام کو مطمئن رکھا جائے کہ مولویوں نے اسلام میں بڑی خرابی پیدا کردی ہے، اسلام بہت لمبا ہوگیا ہے۔ حدیثوں نے اس میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ چنانچہ مولوی عبداللہ صاحب سے مولوی رمضان صاحب تک یہ مختصر سا کارخانہ چلتا رہا اور ان سب بزرگوں کو آرڈر دیا گیا کہ ازراہ عنایت ہلکی پھلکی نماز بنادیں تاکہ مولویوں کی پرانی نماز سے پیچھا چھوٹ جائے۔ کام ہوتا رہا، نماز بنتی رہی، منکرینِ حدیث کے بڑے بڑے فاضل دن رات کام کرتے رہے۔ پچاس سال تک اکابر پر پھبتیاں اڑتی رہیں، پچاس سال کے بعد معلوم ہوا کوئی متفقہ نماز نہیں بن سکی، نہ رکعات کا تعین ہو سکا، نہ وظائف طے ہو سکے نہ اوقات کا فیصلہ ہو سکا۔ پچاس سال کے بعد کاریگر باہم دگر دست وگریباں ہوگئے۔ ہر ایک نے دوسرے کے کام کو غلط اور ناتمام کہا۔

آخر نماز نہ بن سکی‘ مالک تنگ آ گیا‘ اس نے آرڈر واپس لے لیا اور کارخانہ بند کر دیا اور کاریگر ملتان‘ گوجرانوالہ‘ ڈیرہ غازیخاں منتقل ہو گئے۔

یہاں تک اسلام چند فقہی مسائل کا نام تھا‘ جن میں سے سب سے پہلے نماز ہی ان حضرات کی نگاہ میں آئی جو نہ بن سکی یہ حضرات نہ اسلام کو نظامِ زندگی سمجھتے تھے نہ ہی انہوں نے اس کے لیے کوئی کوشش کی۔

پچاس سال کے بعد کچھ کلرک ریٹائر ہوئے کچھ یورپ زدہ حضرات احادیث کی تشریحات سے تنگ آئے ہوئے تھے جنہیں نماز‘ روزہ‘ زکوٰۃ‘ حج اور قربانی وغیرہ مسائل کسی طرح پسند نہ تھے‘ انہوں نے نظریہ تو مولوی عبداللہ صاحب سے مُستعار لیا لیکن اپنے سابقہ تجربے سے فائدہ اٹھا کر نماز‘ روزہ‘ ارکانِ اسلام کو کچھ غیر ضروری سمجھ کر نظر انداز کر دیا اور فرمایا:
یہ سب وقتی احکام تھے جو اس وقت اُمّت کو دیئے گئے تھے۔ اب دُنیا بہت آگے نکل چکی ہے‘ وقت کے تقاضے بدل چکے ہیں‘ یہ نماز‘ وضو‘ روزے‘ عبادات پرانا فرسودہ فلسفہ ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں زندگی کی دوڑ میں یورپ سے آگے نکلنا ہے۔ اس لیے اب عورت کو برقعہ اتار پھینکنا چاہیے‘ اسے حق ملنا چاہیے کہ وہ سرِ محفل اپنے حسن کی نمائش کرے۔ کلب میں دوستوں سے ملے‘ مرد کو خواہ مخواہ اس پر بدگمان نہیں ہونا چاہیے‘ ہر ایک کو اپنی خواہشات پورا کرنے کا حق ہے۔ یہ پابندیاں اور ستر‘ شرم وحیا یہ حدیثوں نے دین میں شامل کی ہیں۔ اب قرآن کے الفاظ یا ترجمہ کی ضرورت نہیں۔ اب صرف مفہوم اور مقصد سمجھنا چاہیے اور قرآن اور اسلام کو نئے تقاضوں اور زندگی کی جدید راہوں سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ اگر یہ کشادگی اسلام میں پیدا نہ کی جا سکی تو زندگی آگے نکل جائے گی‘ اسلام پیچھے رہ جائے گا‘ اس لیے قرآن کی تشریح وقت کے مطابق ہونی چاہیے‘ حدیث کی حیثیت غیر مستند تاریخ کی ہے۔ اگر ضرورت محسوس ہو تو کبھی اس طرف بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔ لیکن اس کی تفصیلات اور آنحضرت ﷺ کے قول وفعل اور آپ کی خاموشیاں اگر دین تصور ہوں تو اسلام تنگ ہو جائے گا اور مسلمانوں کے لیے اس دنیا میں رہنا ناممکن ہو جائے گا۔ انہیں قانون کی اساس نہیں بنانا چاہیے۔ پیش آمدہ حوادث کے متعلق ہر زمانہ میں اس وقت کے لوگ اپنے حالات کے مطابق قرآن کی تفسیر

کریں گے۔ تفسیر میں سلف یا خلف یا آنحضرت ﷺ کے ارشادات کی پابندی قطعاً نہیں ہوگی بلکہ یہ مجتہد اور مفسر حضرات جمہور کے انتخاب سے مقرر ہوں گے۔ ملاحظہ ہو ''فیصلہ جسٹس محمد شفیع'' جہاں تک قرآن مجید کی تعبیر اور اس کے کلیات کو جزئیات پر منطبق کرنے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں جو کچھ عوام کے منتخب نمائندے طے کریں گے اسے بھی قانون کا درجہ حاصل ہوگا۔'' [1]

اسی قسم کے منتخب نمائندوں سے ایک مرکزِ ملت تشکیل پائے گا۔ ہر زمانہ کا مرکزِ ملت احکامِ اسلامی، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، نکاح، طلاق، بیوع، اجارہ، میراث، اموالِ غنیمت، ٹیکس وغیرہ کے متعلق آزادانہ فیصلہ کرے گا۔ وہ پیغمبر ﷺ اور ان کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے فیصلوں سے آزاد ہوگا۔ کسی دوسرے مرکزِ ملت کے فیصلے بھی اس کے لیے شرعی یا دینی حیثیت نہیں رکھیں گے۔

پہلے اور اب

انکارِ حدیث کے پہلے دور کی حیثیت پہلے ذکر ہو چکی اب ان پڑھے لکھے بابو صاحبان کے نزدیک اسلام ایک چھوٹی سی ریاست ہے جس میں ہر چند ہزار آدمی آباد ہیں۔ بس اس اسٹیٹ کے منتخب نمائندوں کو ان چند ہزار آدمیوں کی ضروریات سے تعلق ہے اور بس یا اسلام ایک دفتر ہے جس میں چند بابو صاحبان کام کرتے ہیں۔ ان کی ذمہ داری صرف اس قدر ہے کہ وہ اس دفتر کے رفقا کی ضروریات کا خیال رکھیں۔ اسلام بلحاظِ نظامِ زندگی یا بلحاظِ نظامِ انسانیت نہ پہلے حضرات کی نظر میں تھا نہ یہ بابو حضرات ہی پوری دنیا کی دینی اور معاشی زندگی اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ مولوی عبداللہ اور ان کے ہم قرن رفقا کی ناکامی اور غلط روی پر تو اتفاق ہے ہم ان کو پہلے ہی غلط سمجھتے تھے، اب یہ ان کے ہم مسلک حضرات بھی انہیں غلط سمجھتے ہیں۔ اس وقت نہ تو وہ تراجمۃ القرآن درست ہے، نہ وہ تشریحات صحیح ہیں جو مولوی عبداللہ، مولوی رمضان، مولوی حشمت علی سابق منکرینِ حدیث کے متبنی محبوب شاہ آف گوجرانوالہ نے کیں نہ وہ نماز درست ہے جس پر ان سابقون اولون کے قریب قریب پچاس سال صرف

---

[1] ۔۔۔ قرآنی منصب رسالت: ص ۲۵٦۔

ہوئے نہ مولوی احمد دین صاحب امرت سری کی بیان القرآن ہی کوئی ایسا علمی ذخیرہ ہے جس سے وقت کی ضروریات کا حل تلاش کیا جا سکے۔ اب ان تمام مشکلات کا حل ان بابو صاحبان کی نظر میں صرف مرکزِ ملت ہے اور اس کے لیے الیکشن۔

مرکزِ ملّت کی مشکلات

ہمارے سامنے مرکزِ ملت کے مرتبین کی کوئی ایسی مکمل تحریر نہیں جس سے اس کی پوری پوری حقیقت معلوم کی جا سکے نہ ہی ان حلقوں سے جہاں تک ہمارا علم ہے کوئی ایسا دستور اور منشور شائع ہوا ہے جس سے مرکزِ ملت کا مفصل پروگرام اور طریق عمل معلوم ہو نہ ہی اس کی دستوری حیثیت کا کوئی مرقع ہماری نظر میں ہے جسے نئے منکرینِ سنت کی ذمہ دار جماعت نے شائع کیا ہو۔ اس لیے ہماری تنقیدی گزارشات اس کی امکانی یا متحمل مشکلات سے متعلق ہوں گی۔

① مرکزِ ملت کی تشکیل اگر عوام کے نمائندے کریں اور وہ نمائندے بھی قرآن فہمی میں عوام ہی کی طرح ہوں تو یہ مرکزِ ملت جہلا کا مجموعہ ہوگا جیسے کہ ہم کونسلوں، اسمبلیوں اور یونیورسٹیوں کے نمائندوں کو دیکھتے ہیں وہ بے چارے پارٹی کے نقطۂ نظر سے ہاتھ اٹھانے کے سوا کچھ بھی نہیں سمجھتے۔ یہ مرکزِ ملت فقہ، تفسیر، استدلال اور اجتہاد کے لیے قطعی بے سُود بلکہ مضر ہوگا۔

② اگر نمائندوں کے لیے کچھ قیود اور پابندیاں ضروری ہوں تو قطع نظر اس سے کہ وہ عوام کے نمائندے نہیں ہوں گے۔ عوام اپنی لاعلمی کی وجہ سے ان کے علمی مقام کو نہیں سمجھ سکیں گے اس لیے یہ ووٹ بالکل غلط استعمال ہوگا جیسے سیاسی انتخابات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ عوام ووٹ کا صحیح استعمال نہیں کر سکتے۔ ہم نے بارہا دیکھا ایک عالم اور قانون دان کے بالمقابل عوام نے ایسے شخص کو ووٹ دیا جو اپنے دستخط نہ کر سکتا تھا۔

③ غالبًا فرمایا جائے گا کہ انتخاب کا حق قرآنی معاشرہ کو دیا جائے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ قرآنی معاشرہ کہاں سے آئے گا اور کب تک دُنیا اس کا انتظار کرے گی نظر بظاہر اگر موجودہ علما کی مخالفت کوئی حکومت بزورِ شمشیر آج ہی ختم کر دے تو بھی دو سال تک قابلِ اعتماد قرآنی معاشرے کا بروئے کار آنا قریب قریب ناممکن ہے گویا یہ تجویز اپنی زندگی سے پہلے ہی آغوش

قبر کی زینت ہوگی۔

④ اس کے ساتھ ہی دنیا کو اب تک انتخاب کا کوئی ایسا طریقہ نہیں مل سکا جس سے بالکل صحیح اور اہل نمائندوں کا انتخاب عمل میں آسکے۔ دُنیا کے معاملہ میں تو عملی کمزوری قابل برداشت ہو سکتی ہے لیکن دین کے معاملہ میں اسے کیونکر برداشت کیا جائے گا کہ نالائق اور بدقماش بندے مرکزِ ملّت کی مسند پر قابض ہوں اور بمصداق حدیثِ پاک ((أَفْتَوْا بِغَيْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوا وَأَضَلُّوا)) [1] جاہل اپنی جہالت سے اپنی اور عوام کی تباہی اور بربادی کا موجب بنیں۔"

جب دین میں احتیاط کا یہ عالم ہو کہ احادیث اس لیے ناقابلِ عمل ہوں کہ وہ اصطلاحی طور پر ظنی ہیں اور یہ مجسم اور حقیقی وہم صرف اس لیے قبول کر لیے جائیں کہ انہیں چند جاہلوں نے چند ووٹوں کی کثرت سے چند کرسیاں سپرد کر دی ہیں۔

انتخاب اور جمہوریت عملاً جس طرح تمام ممالک میں ناکام ہو رہے ہیں ممکن ہے یہ عملی ناکامی نظریاتی ناکامی پر منتج ہو اور دُنیا کسی اور نظریہ کی تلاش میں چل نکلے۔ پھر ہمارے یہ جمہوریت پرست حضرات منہ اٹھا کر دنیا کو دیکھنے لگیں۔

⑤ پھر علیٰ علاتہٖ اگر اتفاقاً کبھی چند سال کے لیے ایسا معاشرہ میسّر آجائے جو واقعی علمی طور پر صحیح اور اہل ہو تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ جو سوچیں وہ درست اور صحیح بھی ہو اور لوگ اس کے کیوں پابند ہوں اور ان کے اجتہادات جب شریعت اور دین نہیں بلکہ ان کے اجتہادات پر ہر زمانہ میں تنقید ہوتی رہی تو اس اجتہاد کو کیوں دین اور شریعت کا نام دیا جائے۔

⑥ ظاہر ہے کہ اس مرکزِ ملّت کے فیصلے دین نہیں ہوں گے اور آنے والے مرکزِ ملّت کو لازماً ان مسائل سے تصادم اور اختلاف کا حق ہوگا تو چند سال کے بعد اگر ان تمام مراکزِ ملّت کی روداد عمل جمع کی جائے تو یہ مجموعہ ایک مضحکہ خیز چیز ہوگا اور آنے والے لوگ اس چوں چوں کے مربّے کو کھلی حماقت تصوّر کریں گے۔

⑦ غالباً اس کے جواب میں یہی کہا جائے گا کہ ہم نے کب اسے شریعت یا دین کہا ہے۔

---

[1] بخاری، کتاب العلم: باب کیف یقبض العلم: رقم ۱۰۰؛ مسلم، کتاب العلم: باب رفع العلم وقبضه، رقم ۶۷۹۶؛ الترمذی، کتاب العلم باب ماجاء فی ذهاب العلم رقم ۲۶۵۲؛ ابن ماجه کتاب السنة باب فی اجتناب الرأی والقیاس: رقم ۵۲؛ الدارمی فی المقدمة باب ذهاب العلم: رقم ۸۲؛ احمد ۱۶۲/۲۔

کب کہا ہے کہ یہ لوگ اسے ضرور قبول کریں تو ادباً گزارش ہے کہ اس میں جدت کیا ہوئی۔ سابق مجتہدین کی فقہ میں اور اس مرکزِ ملت کے فیصلوں میں فرق کیا ہوا۔ مجتہدین کے فیصلوں میں علمی عقیدت شامل تھی۔ یہاں وہ بھی ناپید ہوگی صرف حکومت ہوگی جس کی طفیل یہ حضرات مرکزِ ملت کہلائیں گے۔ اگر یہ مادی قوت نہ ہو تو ان اجتہادات کی اتنی وقعت بھی نہیں جو قہوہ خانوں اور ہوٹلوں میں رونق کا موجب ہوتی ہے۔

⑧ اس کے جواب میں حرفِ آخر کے طور پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ واقعی یہ مادی دباؤ ایک نظام کے لیے ہے جس طرح ایک حکومت اپنے قوانین نافذ کرتی ہے یا بارگاہِ خلافت سے احکام کا نفاذ ہوتا ہے تو اس کے متعلق یہ گزارش ہے کہ ان دونوں میں بین فرق ہے۔ قانونی حکومت جمہوری ہو یا شخصی اس کے احکام کی کوئی شرعی حیثیت نہیں اور دینی حکومت اپنی مادی طاقت سے احکام کا نفاذ کرتی ہے۔ وہ بذاتِ خود احکام کی تخلیق نہیں کر سکتی، حتیٰ کہ پیغمبر اپنی اطاعت اور اپنی مُستقل حیثیت کے باوجود اطاعتِ الٰہی کی ترجمانی کرتا ہے۔ ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ [1] "رسول کی اطاعت دراصل اللہ ہی کی اطاعت ہے" اس لحاظ سے یہ مرکزِ ملت ایک ایسی ذوالوجوہ مخلوق ہے جس کے خمیر میں نہ دین ہے نہ سیاست، اس کے باوجود وہ دونوں پر مسلط ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ ﴿مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝﴾ [2]

⑨ پھر یہ بھی سوچنے کی چیز ہے کہ اس نئی اصطلاع سے حاصل کیا ہوا؟ اس نظام کی ضرورت کیوں ہو؟ اگر یہ دینی نظام ہے تو اسے خلافت یا امارت کہیے۔ اور اگر یہ فقہی کوشش ہے تو اسے اجتہاد کہیے۔ اسے ملت کی مرکزیت تو کسی طرح بھی میسر نہیں آسکتی محض اصطلاحات اور الفاظ کی ہیرا پھیری سے ملت میں اختلاف کرنا ایک مجرمانہ کوشش ہے۔ ایسی قیادت کسی اعزاز کی مستحق نہیں جو محض اختلاف بین المسلمین کے سہارے پر زندہ ہے۔

اجتماعی اجتہاد

مرکزِ ملت کا جو تاثر مختلف اوقات میں دیا گیا ہے اس پر نہ ذہن مطمئن ہوتا ہے نہ ہی کوئی حقیقت ذہن میں اُترتی ہے۔ البتہ اجتہاد کی اجتماعیت ذہن کو متاثر کرتی ہے۔ انفرادی

[1] ٤/النسآء: ٨٠۔ [2] ٦٨/القلم: ٣٦۔

حیثیت سے ممکن ہے اجتماعی طریق زیادہ مفید ثابت ہو۔ مختلف علوم کے ماہر اگر ایک جگہ سر جوڑ کر سوچیں تو غالب خیال ہے کہ مختلف مصالح اور اس کے بالمقابل مضرتوں پر زیادہ سنجیدگی سے غور ہو سکے لیکن اگر اس کے ساتھ انتخاب کی پخ لگا دی گئی تو اس کی ساری افادیت ختم ہو جائے گی۔ بیچارے مجتہد یا الیکشن لڑیں گے یا اجتہاد کریں گے اور اگر خدانخواستہ انتخابات کا انداز بھی یہی رہا جو انگریزی دورِ حکومت کی یادگار ہے تو حضرت المجتہد مع اجتہاد انتخابات میں رہن کی نظر ہو جائیں گے یا پھر باقی مدت قرض ادا کرتے رہیں گے اور رشوت لیتے رہیں گے۔

مختصر یہ کہ محض ایک مفروضہ کی حیثیت سے تو مرکزِ ملت کا ذکر سامعہ نواز ہو سکتا ہے ورد وظیفہ کی طرح تبرکاً اس کا تذکرہ ہو سکتا ہے لیکن عملی اور افادی لحاظ سے تو یہ بالکل بے کار چیز ہے۔ باعمل ذہن اس کا ذکر بھی پسند نہیں کرے گا۔

سُنّت جیسے مفید اور مقدس علم سے انکار کے بعد مرکز ملت کا تصور ذہن کی ایک لغزش ہے اور ایک فکری نامرادی، سنت کو ظنی کہنے والے کن اوہام اور مزخرفات میں گرفتار ہوئے۔ یہ حضرات اتنا نہیں سوچ پائے کہ آخر اس مرکز کے فیصلوں کی حیثیت قرآن کی ہے یا متواتر احادیث کی یا پھر آحاد کی۔ ہمیں تو اوہام اور مزخرفات سے بھی اس کا مقام پست معلوم ہوتا ہے۔ عملاً اس کا اثر محض جدلیات ہوں گے جن پر کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوگا۔

ایک فاضل جج کی غلط فہمیوں پر مبنی تنقیحات اور ان پر ایک نظر

حدیث کی تحقیق موجودہ دور میں

مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے جج میاں محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں:

''میں اس بات کے حق میں نہیں ہوں کہ محدثین کی جمع کردہ احادیث کو اسلامی قانون کے سرچشموں میں سے ایک سرچشمہ تسلیم کر لیا جائے۔ جب تک اس کی دوبارہ جانچ پڑتال نہ کر لی جائے اور یہ پڑتال بھی کسی تنگ نظری یا تعصب پر مبنی نہیں ہونی چاہیے جنہیں امام بخاری وغیرہ نے بے شمار جھوٹی، موضوع اور جعلی حدیثوں میں سے صحیح احادیث کو الگ کرنے کے لیے مقرر کیا تھا۔ نیز ان معیارات کو بھی کام میں لانا

چاہیے جو نئے حقائق و تجربات نے ہمارے لیے فراہم کیے۔“ [1]

احادیث کو نئے انداز پر پرکھا جائے۔ یہ آواز مدت سے زبان و قلم کی نوازش کے بعد سامعہ نواز ہو رہی ہے۔ قریب قریب پچاس سال کا عرصہ ان گرجتے بادلوں پر گزرا ہے اور یہ سنتے کان پک گئے ہیں کہ:

”حدیث کو نئے اصول کی روشنی میں تنقید کی سان پر رکھنا چاہیے۔“

یورپ کے مستشرقین کے کارخانوں میں احادیث کی تنقید کے لیے ہتھیار بن رہے ہیں۔ ہم نصف صدی سے ان کے منتظر ہیں لیکن یہ بادل برستے نہیں تا حال ہم نے کوئی نیا ہتھیار نہیں دیکھا۔ ہمیں بتلایا گیا کہ حدیث قرآن کے خلاف نہیں ہونی چاہیے۔ عرض کیا منظور ہے لیکن قرآن کے مفہوم کی صحت کے لیے بھی معیار لائیے ممکن ہے آپ کو پرکھنے کی تکلیف ہی نہ ہو۔ پھر یہ اصول قدماء ائمہ حدیث کے ہاں کتب حدیث میں موجود ہے یا نہیں۔ مشکل صرف یہ ہے کہ آپ کے ہاں قرآن فہمی کے لیے کوئی اصول اور معیار نہ تھا اس لیے مسئلہ خلط مبحث سے آگے نہ بڑھ سکا۔

پھر فرمایا' حدیث عقل کے خلاف نہ ہو' عرض کیا بالکل درست ہے لیکن ہم نے صدیوں سے عُقَلا کو ٹھوکریں کھاتے دیکھا ہے' سارا علم منطق عُقَلا کو ٹھوکروں سے بچانے کے لیے بنایا گیا لیکن وہ علم خود ٹھوکروں کا معمل اور کارخانہ قرار پایا اور ٹھوکریں ختم نہ ہوئیں۔ پھر جو معیار ہنوز کسی اور معیار کا محتاج اور منتظر ہے۔ اسے موقع دیجئے' وہ اپنی تکمیل کرے۔ موجودہ پوزیشن میں افراد کی عقل کو چھوڑیئے۔ مجموعی طور پر عقل جو کچھ کر سکتی ہے اس سے ائمہ سنت اور فقہائے حدیث نے کب انکار کیا' معلوم نہیں پھر آپ حضرات ناراض کیوں ہیں۔

دراصل ہماری معذرت یا ترجمانی بھی آپ حضرات' منکرین حدیث اور ادارہ طلوع اسلام سے سنتے ہیں اور ان گونگے دانشوروں کا یہ حال ہے کہ وہ آج تک نہیں سمجھا سکے کہ وہ کیا چاہتے ہیں؟ وہ آج تک جو کر سکے وہ سلب تھا اور تخریب۔ تعمیر اور ایجاب کے طور پر وہ کیا کر پائے؟ آنکھیں اب تک اس کی منتظر ہیں۔

فرمایا گیا حدیث کو متواترات کے خلاف نہیں ہونا چاہیے۔ گزارش کیا گیا منظور ہے

[1] ترجمان القرآن' منصب رسالت: ص ۲۷۶۔

لیکن واقعات کی صحت کے لیے آپ کے ریسرچ کی کسوٹی کیا ہے؟ اس کا جواب موت نما خاموشی سے دیا گیا۔

یہ لوگ!

یہ گفتگو ان طویل مناظرات اور مجادلات کا ملخص ہے جو مولوی عبداللہ صاحب سے لے کر حضرت مولانا غلام احمد پرویز صاحب تک ان حضرات نے فرمائی جن میں شاید کوئی ذہین آدمی نہیں۔ اصُول کی تشکیل تو بڑی بات ہے عام فقہی فروع کا استنباط اور استخراج بھی ان حضرات کے فہم سے بالا ہے یہ اعتراض تو کر سکتے ہیں مگر مصالح پر کلی اور جامع نظر کے بعد جزئیات کا استخراج اور قواعد کلیہ کی تشکیل کی استعداد ان کے خیمہ میں نہیں ہے۔

جسٹس محمد شفیع صاحب بڑی اونچی اور مستند جگہ سے بولے تھے خیال تھا کوئی تعمیری اور کام کی چیز فرمائیں گے لیکن وہ غور فرمائیں کہ ان کے معلومات پرویز صاحب کی ترجمان اور مولوی محمد علی لاہوری کی نقالی سے زیادہ نہیں اور وہ بھی یک طرفہ کاش وہ ائمہ سُنّت اور ناقدینِ حدیث سے براہِ راست کچھ سُنتے پھر انہیں معلوم ہوتا کہ جو کچھ وہ چاہتے ہیں وہاں بحمد اللہ بہت کچھ موجود ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ اور جو وہاں نہیں تجربہ آپ کو بتائے گا کہ اس کی ضرورت کسی دوسری راہ سے پوری کر دی گئی ہے۔

وَكَمْ مِنْ عَائِبٍ قَوْلًا صَحِيْحًا
وَآفَتُهُ مِنَ الْفَهْمِ السَّقِيْمِ

علمِ حدیث متحرک علم ہے

فنِ حدیث نے بتدریج ترقی کی۔ اسی طرح اس کے اصُول میں بھی تدریجی ارتقا پایا جاتا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ مراسیل حجت سمجھتے تھے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اسانید کے تتبع سے محسوس کیا کہ اس میں ضعف کا امکان ہے۔ صحابی کے بعد بعض اوقات کئی تابعی آجاتے ہیں اس لیے ضروری نہیں کہ تابعی کے بعد متروک راوی صرف صحابی ہو۔ علمائے حدیث نے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی اس نکتہ آفرینی کو قبول فرمایا اور مرسل کی حجیت سے

انکار کر دیا۔ حالانکہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ حدیث میں اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فقہ میں سب کے تقریباً اُستاد تھے۔ (1)

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اہلِ مدینہ کے عمل کو حجت سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اہلِ مدینہ کا عمل سُنّت سے ماخوذ ہے۔ ائمہ حدیث نے اس اصُول سے انکار فرمادیا۔ (2) ملاحظہ ہو ''محلی'' اور ''احکام'' فی اصول الاحکام لابن حزم اور ''اعلام الموقعین'' اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمھما اللہ کا رسالہ ''مذہب اہل المدینہ''۔ بعض ائمہ کا خیال تھا کہ راوی کا فتویٰ اگر اس کی مرفوع روایت کے خلاف ہو تو اس کے فتویٰ کو روایت پر ترجیح دی جائے گی۔ (3) لیکن ائمہ حدیث نے تحقیق کے بعد فیصلہ فرمایا کہ اگر فتویٰ کی تائید کسی مرفوع حدیث سے نہ ہو تو فتویٰ کے لیے اور بھی احتمالات ہو سکتے ہیں۔ اس لیے صحیح یہی ہے کہ ترجیح روایت اور مرفوع صحیح حدیث کو دی جائے۔

صحیح حدیث کی تعریف میں علما کے مختلف اقوال ہیں جن کا تذکرہ الجزائری نے توجیہہ النظر میں اور خطیب نے الکفایہ (4) میں فرمایا ہے لیکن بالآخر صحیح حدیث کی یہ تعریف طے ہوئی ''جسے عادل اور ضابط راوی روایت کرے اس میں نہ کوئی علت ہو اور نہ شذوذ ہو اور راوی کا مروی عنہ سے سماع ثابت ہو۔'' (5)

غرض مختلف مسائل میں بتدریج فیصلہ ہوا۔ تدریج کا یہی مطلب ہے کہ مسئلہ بحث و نظر کے بعد کسی قطعی مرحلہ پر پہنچ جائے۔ اہلِ حدیث اور حدیث میں یہی طریق جاری رہا یہاں تک کہ اکثر مسائل میں بحث و نظر کی ضرورت رہی نہ گنجائش۔

آج بھی ہمارے پاس قرآن کا کوئی حکم اور سُنّت کا ایسا کوئی فیصلہ موجود نہیں کہ تنقید

---

(1) **الاحکام فی اصول الاحکام**' ۱/۱۴۵-۱۴۸ الجزء الثانی فی المرسل؛ **المحلی**' بالآثار لابن حزم' ۱/۷۲-۷۳؛ مسائل من الاصول والمبحث السابع باب السباب اختلاف مذاهب الفقهاء؛ **حجة الله البالغة** لشاه ولی الله' ۱/۱۴۶ واصول الفقه لحمدالخضری ص۲۵۴۔ (2) **الاحکام فی اصول الاحکام**' لا بن حزم فصل هل یجوز تقلید اهل المدینة ۲/۳۳۳؛ **حجة الله البالغة**' لشاه ولی الله' اختلاف الفقهاء ۱۴۵ وترتیب المدارك وتقریب المسالك لمعرفة اعلام مذهب مالك ۱-۲/۶۷ باب بیان والمحصول فی علم اصول الفقه' ۳/۸۶؛ **اعلام الموقعین**' ۲/۳۶۱ الکلام علی عمل اهل المدینه۔

(3) **اصول البزدوی**' لفخرالاسلام علی بن محمد البزدوی' باب تقسیم للراوی' ص۱۵۹۔

(4) **کتاب الکفایة فی علم الروایة**' ۵۶ و**توجیه النظر**' المبحث الاول' ص۶۹۔

(5) **مقدمة ابن صلاح**' ص۲۱۔

روایات واحادیث پر بحث ونظر کی راہیں بند ہو چکی ہیں۔ بلا شبہ فن متحرک ہے لیکن علمانے ہر پہلو پر بحث وفکر کے بعد محسوس فرمایا کہ ضرورت کے مطابق فن کی تکمیل ہو چکی۔ آج سے صدیوں پیشتر کے واقعات پر احتمالات اور امکان کے گھوڑے دوڑانا ٹھیک نہیں۔ اس سے بحث برائے بحث کے سوا کچھ حاصل نہیں۔

صرف، نحو، معانی، بیان کا بھی یہی حال ہے کہ قریب قریب یہ فن کافی حد تک مکمل ہیں۔ ان فنون پر بحث سے شارع نے نہیں روکا۔ لیکن واقعات نے بتایا کہ اس کی ضرورت نہیں۔

اصُولِ روایت

علامہ شبلی مرحوم نے سیرت النعمان میں فقہ حنفیہ کی حمایت میں فرمایا کہ اصُولِ حدیث میں درایتاً بحث نہیں کی گئی۔ [1] لیکن اس مسئلہ میں مولانا مرحوم کوئی قیمتی معلومات مُہیّا نہیں فرما سکے اور جو فرمایا اس پر حسن البیان اور سیرۃ البخاری میں مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا عبدالسلام مُبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ نے اور الارشاد میں مولانا محمد ابو یحییٰ شاہ جہانپوری رحمۃ اللہ علیہ نے قلم اٹھایا اور اس بحث کو انتہا تک پہنچا دیا۔ نتیجۃً اس کے بعد کی تصانیف میں مولانا شبلی نے سیرۃ النعمان کے اندازِ بحث ونظر کو بدل دیا۔ بلکہ آیندہ کے لیے تصنیف میں وہ راستہ اختیار ہی نہیں کیا۔

علمائے سنت کا یہ قطعی خیال نہیں کہ اصولِ حدیث میں اضافہ شرعاً ممنوع ہے یا ان اصُول پر تنقید شرعاً درست نہیں یا ان کا من وعن قبول کرنا شرعاً ضروری ہے بلکہ ان کا خیال یہ ہے کہ حدیث کی چھان پھٹک اور اس کے قواعد اس حد تک پہنچ چکے ہیں کہ مزید بحث بے ضرورت ہے۔

اصولِ حدیث کے قواعد کا تعلق یا لغت سے ہے یا واقعات سے یا پھر ان کا تعلق عقل سے ہے جو بحث ونظر کے بعد مناسب حد تک پہنچ چکے ہیں۔ اب ان حقائق کو محض احتمالات سے نہیں بدلا جا سکتا۔

بعض مثالیں

① مثلاً امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ راوی اور مروی عنہ میں ملاقات ممکن ہو تو یہ

---

[1] سیرۃ نعمان، لشبلی نعمانی: ۱۳۸۔

اتصال کے حکم میں ہوگا۔ وہ یہ ضروری نہیں سمجھتے کہ فی الواقع ان دونوں میں ملاقات ثابت کرنے کی کوشش کی جائے۔ [1] لیکن امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کم از کم ان دونوں میں ایک دفعہ فی الواقع ملاقات ضروری ہے ورنہ اتصال مشکوک ہوگا۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے مقدمہ صحیح مسلم میں اس بحث کو نکھارنے کی کوشش کی ہے لیکن جمہور ائمہ نے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے خیال کو بحث کی تکمیل سمجھا۔ اب مزید یہی کہا جا سکتا ہے کہ ہر روایت کے لیے بار بار ملاقات ضروری ہے آپ غور فرمائیں یہ خیال بدگمانی کے مترادف ہے۔ ایک آدمی کی صداقت جب ایک دو دفعہ ثابت ہو جائے پھر بلا وجہ اسے جھوٹ سے متہم نہیں کیا جا سکتا۔

② اہلِ بدعت کی روایت کے متعلق ائمہ میں اختلاف تھا۔ بعض نے اس کی روایت کو مطلقاً رد کیا۔ بعض نے بلا شرط قبول فرمایا بالآخر یہی رائے قائم ہوئی کہ اگر راوی بدعت کا داعی ہو تو اس کی روایت مقبول نہیں ہوگی اور اگر روایت میں بدعت کی حمایت ہو تو بھی روایت مقبول نہیں ہوگی البتہ نفس مسلک اور عقیدہ کو روایت کے قبول اور رد میں ائمہ حدیث کے نزدیک کوئی دخل نہیں۔ [2] اسی لیے وہ شرط مذکور کے ساتھ شیعہ اور خوارج کی روایت کو اختلاف کے باوجود قبول فرماتے ہیں۔

غرض یہ کہ اصولِ حدیث میں جمود نہیں بلکہ اس میں ارتقا کے لیے پوری پوری استعداد موجود ہے لیکن جب بحث و نظر ایک خاص نکتہ پر پہنچ جائے تو گفتگو کی گنجائش خود ہی ختم ہو جاتی ہے۔ بحث و نظر کے بعد اہلِ فن ایک مقام پر پہنچ جانے کے بعد بحث کی گنجائش یا ضرورت نہیں سمجھتے یہ فن میں جمود نہیں بلکہ تکمیل ہے لیکن ہر فن کی تکمیل کے مراحل کا صحیح فیصلہ ماہرین فن ہی کر سکتے ہیں۔ ہائی کورٹ کے جج قانون کا فیصلہ تو کر سکتے ہیں لیکن طب اور انجینئرنگ میں ان کے فیصلہ کو کوئی اہمیت نہیں دی جائے گی۔

ائمہ حدیث کی رجال پر نظر

① هَيْثَمُ بْنُ بِشْرٍ وَاسِطِي : زہری کے شاگرد ہیں اور استاد شاگرد دونوں ثقہ ہیں اور

---

[1] مسلم فی المقدمة، باب صحة الاحتجاج بالحديث المصنفين اذا امكن لقاء المعنعنين ولم يكن فيهم مدلس: ص٦٧٩۔

[2] تدريب الراوی، ۳/۲۲۸۔ ۲۸۹ حکم رواية اهل البدع۔

دونوں بخاری کے رجال میں سے ہیں لیکن ہشیم کی روایت زہری سے صحیح نہیں۔ اس لیے صحیح بخاری میں هیشم عن الزهری کی کوئی روایت نہیں۔ 1 محدثین کی دقت نظر کا یہ حال ہے کہ وہ ہر شاگرد کی مرویات پر اُستاد کے لحاظ سے گہری نظر رکھتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ ضبط میں کہاں خلل واقع ہوا اور فلاں شاگرد نے اُستاد سے اخذ کرنے میں کہاں کوتاہی کی۔

② ورقاء بن عمر یشکری: ثقہ ہیں لیکن منصور بن المعتمر کی روایات میں وہ پورے ضابط نہیں ہیں۔ یہ دونوں رجال بھی بخاری کے ہیں لیکن ورقاء کی روایت منصور سے آپ کو صحیح بخاری میں نہیں ملے گی کیوں کہ ورقاء منصور کی روایات میں ثقہ نہیں۔ 2 آپ کو نئے تحقیقی ہتھیاروں سے فن پر حملہ کرنے کا حق حاصل ہے لیکن آپ کے اکتشافات واقعات میں کیا نیا رنگ بھریں گے؟ راوی راوی رہے گا اور مروی عنہ مروی عنہ ہوگا آپ اس میں کیا جدت فرمائیں گے۔

③ وَضَّاحُ بْنُ عَبْدِ اللهِ: باتفاق ائمہ قابلِ اعتماد ہیں اور ثقہ لیکن قتادہ کی روایات میں وہ ثقہ نہیں۔ اس لیے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ صحیح میں وَضَّاحُ عَنْ قَتَادَةَ کا تذکرہ اپنی شرط کے خلاف سمجھتے ہیں باوجودیکہ دونوں ثقہ ہیں۔

④ ولید بن مسلم دمشقی: بالاتفاق ثقہ ہیں لیکن امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے ان کی روایات صحیح نہیں۔ اس لیے اصولِ ستہ میں ولید کی امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے کوئی روایت نہیں البتہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ولید کی روایت امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ ثقاہت کے باوجود ان کی روایت امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ سے ذکر کی ہے۔ مالک رحمۃ اللہ علیہ سے ثقاہت کے باوجود ان کی روایت کو صحیح نہیں سمجھتے۔

⑤ تدریب الراوی میں حافظ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ہمام اور ابن جریج دونوں ثقہ ہیں لیکن ہمام کی روایت ابن جریج سے صحیح نہیں۔ 3

محدثین کی دقّتِ نظر

ان گزارشات کا مقصد ایک تو یہ واضح کرنا ہے کہ ائمہ حدیث کی نظر رجالِ حدیث میں

---

1 تدریب الراوی، ۳/۷۷ تحقیق شرط للبخاری و مسلم۔

2 تحریر تقریب التھذیب، ۴/۵۸۔۵۹۔

3 تدریب الراوی، ۳/۷۸ تحقیق شرط البخاری و مسلم۔

کس قدر عمیق ہے۔ شخصی تعلقات اور شیخ وتلمیذ میں باہم تعلق اور استعداد کے متعلق ان کی نگاہ کس قدر غائر ہے۔

دوسرا یہ کہ آپ حضرات سمجھ سکیں کہ کسی فن کے مخفی گوشوں پر ایسی محققانہ نظر کسی سازش کا نتیجہ ہے؟ یا محنت کے گہرے جذبات اور مخلصانہ عقیدت اس کی داعی ہے؟ انکارِ حدیث کے نظریہ سے متاثر ہونے والے مخلصین سے میری درخواست ہے۔ کہ توجیہ النظر [1] للعلامہ طاہر بن صالح الجزائری، قواعد التحدیث لجمال الدین القاسمی، تدریب الراوی للسیوطی، علوم الحدیث للحاکم، مقدمہ ابن صلاح اور اختصار علوم الحدیث للحافظ ابن کثیر میں علوم الحدیث کا تنوع ملاحظہ فرمائیں۔ پھر اپنے ضمیر اور دیانت سے سوال کریں کہ آیا جو لوگ سازشیں کرتے ہیں ان کے کام کا یہی انداز ہوتا ہے۔

رہا ادارۂ طلوعِ اسلام تو اس سے نہ علم وفہم کی اُمید ہے نہ تقویٰ اور دیانت کی وہ تو بلا تامّل فرمائیں گے کہ:

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا ان رواۃ سے نقل نہ کرنا فارسی سازش ہے اگر وہ ان کی روایات نقل کر دیتے تو یقیناً فارسی سازش ختم ہو جاتی۔

نظیری را بمحفل بردم وگویا غلط کردم
مرار سوائے عالم ساخت چشم گریہ آلودش

ان حضرات کے لیے تو بہترین مقام یا جیل ہے یا مینٹل ہسپتال۔ ﴿مَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا﴾ [2]

حافظ حازمی کی شروط الائمۃ الخمسۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے جمع اور تدوینِ حدیث میں کس قدر محنت فرمائی اور کس قدر دقتِ نظر سے فقہی ابواب مرتب فرمائے تا کہ ان علوم سے بیش از بیش فائدہ اٹھایا جا سکے۔ ان حضرات پر سازش کی بدگمانی ایمان اور دیانت سے اعلانِ جنگ ہے۔

احادیث میں عُریانی

جسٹس محمد شفیع صاحب نے حضرت عائشہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہما کی بعض احادیث جو غسلِ

---

[1] توجیه النظر، ۲۱_۲۲ الفائدة الثالثة۔ [2] ٤/النساء:۷۸۔

جنابت درمیاں بیوی کے باہمی تعلقات سے متعلق ہیں۔ ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے:

''میں یہ باور کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ یہ دونوں ازواج جو ہر لحاظ سے کامل تھیں' انہوں نے اس عُریانی کے ساتھ اپنی پرائیویٹ باتوں کو ظاہر کر دیا ہوگا جوان کے اور محمد رسول اللہ ﷺ کے درمیان میاں بیوی کی صورت میں ہوئی ہوں گی۔'' [1]

یہ درست ہے کہ بعض احادیث میں بعض بیانات عُریاں طور پر مذکور ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے عیسائی اور سماجی حضرات نے ان پر اعتراض کیا ہے اور ان سے سن کر ہمارے بعض شیعہ اور اہلِ قرآن دوست بھی ان احادیث کو اپنی تنقید کا ہدف بناتے رہے ہیں مگر ان حضرات کے اندازِ گفتگو سے طبیعت کو نہ تعجب ہوا نہ پریشانی اس لیے کہ ان حضرات کا اندازِ فکر معلوم ہے لیکن جسٹس محمد شفیع صاحب نے جس کرسی سے بات کی ہے وہاں کی عقل ودانش کے متعلق ملک کے اربابِ فکر کو اعتماد ہے۔ یہاں اتنی سادہ بلکہ مہمل تنقید کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔

گفتگو میں عریانی اخلاقاً معیوب ہے اور میاں بیوی کے مخصوص تعلقات کا بلا وجہ تذکرہ شرعاً ویسے بھی ناجائز ہے لیکن جب ضرورت داعی ہو تو پھر اس عریانی کا تذکرہ صرف جائز ہی نہیں بلکہ ضروری ہے۔

محترم جسٹس محمد شفیع صاحب نے کبھی زنا بالجبر اور نامردی کے کیس سُنے ہوں گے جہاں ایک طرف زنا بالجبر کی سنگین سزا کا خطرہ ہے تو دوسری طرف پردہ داری کا اخلاقی تقاضا مگر یہاں عُریانی کا اخلاقی تقاضا قطعاً تفتیش کی راہ میں حائل نہیں ہوگا۔

اسی طرح جب عورت خاوند کے متعلق شکایات کرے کہ یہ جنسی ضرورت پر قادر نہیں۔ ایک طرف اس تعلق کے ہمیشہ کے لیے انقطاع کا مطالبہ ہے اور دوسری طرف اخلاق کا تقاضا کہ میاں بیوی کے معاملات عریاں نہ ہو فرمایئے آپ کسے ترجیح دیں گے؟ اگر خاوند استغاثہ کی صحت کا انکار کر دے تو شاید اس عریانی کی ڈاکٹری معاینہ تک نوبت پہنچے گی تب یہ شرعاً واخلاقاً ہر طرح جائز اور درست ہوگا۔

---

[1] ترجمان القرآن' منصب رسالت نمبر: ص۲۵۶۔

بالکل یہی حال درس وتدریس اور تعلیم و تعلم کا ہے۔ حضرت عائشہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہما نے یہ تذکرہ کسی عوامی تقریر میں نہیں فرمایا بلکہ بعض بچے اپنی اماں سے بعض مسائل دریافت کر رہے ہیں اور چونکہ وہ سنت کو شرعی حجت سمجھتے ہیں اس لیے چاہتے ہیں کہ مسئلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول یا فعل یا تقریر سے حل ہو۔ اب یہاں دو تقاضے ہیں۔

① ایک علم اور فہم کا تقاضا ہے

② دوسرا اخلاق اور پردہ داری کا

اگر یہاں ان رسمی اخلاقی اقدار کا احترام کیا جائے تو نہ مسئلہ سمجھ میں آئے گا اور نہ طالب اور سائل کی تسکین ہوگی۔

درس وتدریس یا مقدمات کو بھی جانے دیجیے۔ بعض خانگی نزاعوں میں اس قسم کے تذکرے بعض اوقات ضرورت کے وقت اس سے زیادہ عُریاں طریق سے سامنے آتے ہیں کہ وہاں اس کے سوا چارہ بھی نہیں ہوتا اور وہ نزاع رفع نہیں ہو سکتی جب تک تھوڑی سی عُریانی استعمال نہ کی جائے۔

مساجد میں بعض اوقات لوگ طہارت کے مسائل دریافت کرنے آتے ہیں تو مسئلہ سمجھنے کے لیے عورتیں بھی مفتی کے سامنے کسی قدر عریانی کے لیے مجبور ہو جاتی ہیں۔

ان تصریحات کے بعد ہم یہ گزارش کریں گے کہ ایک ہائی کورٹ کا جج اگر اسی عامیانہ انداز سے سوچنے لگے تو نہ صرف ہائی کورٹ کا وقار ختم ہو جائے گا بلکہ ماتحت عدالتیں آپ کے اس طرح کے محاکمات سے تنگ آ جائیں گی۔ ماتحت عدالتیں تفتیش کے بعد بعض فیصلے کریں گی مگر آپ پورے ناز سے فرمائیں گے کہ:

میں باور نہیں کر سکتا کہ کسی عورت کا عدالتی بیان اتنا عریاں ہو سکتا ہے۔

قرآن عزیز میں عُریانی

بعض واجبی ضرورتوں کے پیشِ نظر قرآن عزیز نے بھی خاصا عریاں اندازِ بیان اختیار فرمایا ہے۔ مثلاً

علمائے یہود کی تہمت طرازی اور نصاریٰ کے غلو نے ایسی صورت پیدا کر دی تھی کہ

حضرت مسیح علیہ السلام کے مقام کو اس طرح نکھارا جائے کہ دونوں فریق اپنے اپنے موقف پر نظر ثانی کریں معاملہ اس قدر چھان پھٹک دیا جائے کہ ہر فریق کو اپنی غلطی کا احساس ہو اور یہ عریانی کے سوا مشکل تھا۔ چنانچہ ارشاد ہوا۔

﴿وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِيْ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا﴾ 1

﴿وَالَّتِيْ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا﴾ 2

''عمران کی بیٹی مریم نے شرمگاہ کو پاک رکھا اور ہم نے اس میں اپنی طرف سے روح پھونک دی۔'' اھ۔

سورۂ تحریم میں ضمیر مذکر کا مرجع لفظ فرج ہے اور سورۂ انبیاء میں حضرت مریم صدیقہ علیہا السلام۔ اس عریانی کی ضرورت تھی۔ اس عریانی کے بغیر نہ یہود اپنی ہٹ سے باز آتے نہ عیسائی اپنا غلو ترک کرتے۔ مصلحت کا تقاضا تھا کہ بات ذرا عریاں ہو جائے۔

جسٹس شفیع صاحب تو فرمائیں گے' میں باور نہیں کرسکتا کہ خدا تعالیٰ نے ایک پاک باز اور مقدس عورت کے متعلق اس قدر عریاں الفاظ استعمال فرمائے ہوں لیکن ان کے سوا چارہ نہ تھا۔

پھر یہی تذکرہ سورۂ مریم میں ملاحظہ فرمایئے۔

﴿اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا۝﴾ 3

اسی طرح حضرت مریم علیہا السلام نے بچے کی پیدائش کے متعلق جو معذرت کا طریق اختیار فرمایا ہے کافی عریاں ہے۔ 4 آپ اسے باور فرمائیں یا نہ فرمائیں حالات کا تقاضا یہی تھا کہ براءت کے لیے عریاں لفظ استعمال ہوں۔ ان عورتوں کا ذکر فرماتے ہوئے جن سے نکاح حرام ہے۔ فرمایا:

﴿وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ز فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ ز﴾ 5

---

1 ٦٦/التحریم:١٢۔ 2 ٢١/الانبیآء:٩١۔

3 ١٩/مریم:٢٠۔ 4 ٣/آل عمران:٤٧۔ 5 ٤/النسآء:٢٣۔

ربیبہ کے نکاح کی حرمت کے ذکر میں اس کی والدہ کے متعلق جس شرط کا ذکر فرمایا ہے وہ ازدواجی تعلق کی آخری صورت ہے۔ امید ہے آپ باور فرمائیں گے کہ اس میں کافی عریانی ہے لیکن اس عریانی کے سوا چارہ نہیں۔

﴿نِسَآءُ کُمۡ حَرۡثٌ لَّکُمۡ فَاۡتُوۡا حَرۡثَکُمۡ اَنّٰی شِئۡتُمۡ﴾ ❶

''تمہاری عورتیں کھیتی ہیں تم اپنی کھیتی کے پاس جہاں سے چاہو آؤ۔''

اس میں کچھ عُریانی محسوس ہوتی ہے۔

﴿اَلَمۡ یَکُ نُطۡفَةً مِّنۡ مَّنِیٍّ یُّمۡنٰی ۝﴾ ❷

﴿وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوۡجَیۡنِ الذَّکَرَ وَالۡاُنۡثٰی ۝ مِنۡ نُّطۡفَةٍ اِذَا تُمۡنٰی ۝﴾ ❸

﴿اَفَرَءَیۡتُمۡ مَّا تُمۡنُوۡنَ ۝ ءَاَنۡتُمۡ تَخۡلُقُوۡنَهٗۤ اَمۡ نَحۡنُ الۡخٰلِقُوۡنَ ۝﴾ ❹

یمنی'' تمنی' اور ما تمنون میں جس حقیقت کا اظہار فرمایا گیا ہے اس میں بڑی عُریانی ہے لیکن نعمت تخلیق کے اظہار کے لیے یہ عریانی موزوں ترین راہ ہے۔ اس لیے شرم وحیا کے کتنے ہی عاشق کیوں نہ ہوں ایسے مواقع پر یہ عریاں انداز باور کرنا ہی پڑے گا۔

اس قسم کی عریانی قرآن نے کئی جگہ اختیار فرمائی ہے۔ زندگی کے مختلف مراحل میں ہر آدمی کو عُریانی سے کم وبیش سابقہ ہوتا ہے۔ یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ آپ حضرات کی نزاکت گفتگو میں اس انشراح کو پسند نہیں کرتی حالانکہ عملاً ننگا ہونا شرعاً' اخلاقاً' عرفاً جرم ہے لیکن بعض مواقع پر عملی عریانی کی کھلی اجازت مرحمت فرمائی ہے۔ یہ ضرورت کا تقاضا ہے:

﴿وَالَّذِیۡنَ هُمۡ لِفُرُوۡجِهِمۡ حٰفِظُوۡنَ ۝ اِلَّا عَلٰۤی اَزۡوَاجِهِمۡ اَوۡ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُهُمۡ فَاِنَّهُمۡ غَیۡرُ مَلُوۡمِیۡنَ ۝﴾ ❺

''اہلِ ایمان اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں مگر بیویوں اور لونڈیوں کے ساتھ عریانی کی اجازت ہے۔'' آپ باور فرمائیں یا نہ فرمائیں قرآن نے یہاں ضرورتاً بالکل ننگا ہونے کی اجازت فرمائی ہے اور اس عریانی کو انسان فطرتاً پسند کرتا ہے اور ضرورتاً بھی۔

---

❶ ۲/البقرہ:۲۲۳۔ ❷ ۷۵/القیامۃ:۳۷۔ ❸ ۵۳/النجم:۴۵۔۴۶۔
❹ ۵٦/الواقعہ:۵۸۔۵۹۔ ❺ ۷۰/المعارج:۲۹۔۳۰۔

اصل مُصیبت

اصل مُصیبت یہ ہے کہ آپ مذہب کو زندگی اور اس کے تمام گوشوں پر محیط نہیں سمجھتے۔ آپ اسے ہر انسان کا پرائیویٹ معاملہ سمجھتے ہیں اور اس کے عمومی مصالح کو خصوصی اور شخصی اختلاف کے پیمانوں سے ناپتے ہیں۔ معلوم ہے کہ پوری انسانیت کے پیمانے، شخصی اور افراد کے پیمانوں سے مختلف ہیں۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ کی ذمہ داریوں کو آپ زیادہ سے زیادہ ایک چیف جسٹس کی ذمہ داریوں کے برابر تصور کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے آپ کے لیے ان مصالح کو باور کرنا مشکل ہو جاتا ہے جو ایک پیغمبر اور پھر خاتم النبیین کے پیشِ نظر ہوتے ہیں جن کی نبوّت پوری دنیا کے لیے اور قیامت تک کے لیے ہے پھر صحابہ کے ذہنی کوائف اور آنحضرت ﷺ کے قول و فعل اور آپ ﷺ کی سُنّت کے ساتھ ان کا تعلق تقریباً اتنا ہی سمجھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ اپنے وقت کے ایک اچھے انسان تھے۔ نتیجہ آنحضرت ﷺ کو بھی آپ اس معیار پر رکھتے ہیں جس پر آپ اپنے خیال سے ایک اچھے آدمی کو پرکھ سکتے ہیں لیکن مسلمان آنحضرت ﷺ کو ہر معاملہ میں واجب الاتباع انسان سمجھتے ہیں۔ اس لیے آپ کے اور صحابہ رضی اللہ عنہم اور عامۃ المسلمین کے معیار میں بڑا فرق ہے۔ منکرینِ حدیث اور آج کے یورپ زدہ لوگوں کے ذہن اور ایک سچے مسلمان یا صحابہ رضی اللہ عنہم کے ذہن میں یہی فرق ہے۔ آپ اپنی اور اپنے عیال و اطفال کی ذمہ داری سے قاصر ہیں جب کہ وہ ساری دُنیا کی ذمہ داری پوری کامیابی سے اپنے ذمے لیے ہوئے ہیں اور اسے انہوں نے صحیح طور پر پورا کیا ہے۔

احادیث کی کثرت

ائمہ حدیث اپنے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے اور اپنی کتابوں کے طریقہ انتخاب اور شرائطِ صحت کو بیان کرتے وقت عموماً لاکھوں احادیث کا ذکر فرماتے ہیں۔ مثلاً

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح بخاری کا انتخاب سات لاکھ (۷۰۰۰۰۰) احادیث سے فرمایا۔

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے مسند کا انتخاب تین لاکھ احادیث سے کیا۔

مسلم کا انتخاب تین لاکھ احادیث سے کیا گیا۔

ابوزرعہ رحمۃ اللہ علیہ کو سات لاکھ احادیث یاد تھیں۔

اس قسم کی تصریحات سے عوام پر دو اثر پڑتے ہیں۔

اول: یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر نبوت کے بعد قریب قریب تئیس (۲۳) یا پچیس (۲۵) سال ہے۔ اس مختصر عرصہ میں ممکن نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر گفتگو فرما سکیں۔ اس لیے یہ مقدار قابلِ اعتماد اور صحیح احادیث کی نہیں ہو سکتی۔

دوم: یہ کہ تدوین شدہ کتب میں احادیث کی تعداد بمشکل ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ اس لیے اس تعداد کے علاوہ باقی سب موضوعات میں بخاری میں مع مکررات تقریباً سات ہزار احادیث ہیں لیکن مکررات کے علاوہ احادیث کی تعداد قریب قریب چار ہزار ہے۔ اسی طرح مسلم نے اپنی صحیح کوئی لاکھ احادیث سے انتخاب فرمایا۔

اس فن سے بے خبر شخص یہ سمجھتا ہے کہ ان ائمہ نے جو احادیث ترک کی ہیں اور ان کتابوں میں ان کا ذکر نہیں آیا وہ سب غلط ہیں اور موضوع' تقریباً اسی قسم کے خیالات کا اظہار جسٹس محمد شفیع صاحب نے اپنے اُس فیصلہ میں فرمایا ہے جو انہوں نے حضانت کے متعلق کیا۔ ❶

یہ دونوں شبہات قلتِ مطالعہ اور لاعلمی پر مبنی ہیں۔ محدثین علی الاطلاق احادیث کی تعداد کا ذکر کرتے ہیں تو اس وقت وہ حدیث کو عام معنیٰ میں لیتے ہیں یعنی مرفوع' موقوف' آثار' تعدادِ اسانید اور احادیث کے متعدد طرق حتیٰ کہ محدثین کی تفاسیر میں ائمہ سلف سے الفاظ کے مفہوم میں جو مختلف اقوال منقول ہیں ان کو بھی وہ حدیث ہی تعبیر فرماتے ہیں بلکہ صرف ضعاف اور موضوعات پر حدیث کا لفظ تو بولا ہی جاتا ہے۔ اس عام معنیٰ کی رو سے حدیث کی تعداد واقعی لاکھوں تک جا پہنچتی ہے لیکن موضوعات کو الگ کیا جائے اور تکرارِ اسانید کو بھی نظر انداز کیا جائے تو احادیث کی صحیح تعداد پچاس ہزار بھی نہیں ہو پاتی۔ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

(قَالَ الْعِرَاقِیُّ فِیْ هٰذَا الْكَلَامِ نَظَرٌ لِقَوْلِ الْبُخَارِیِّ اَحْفَظُ مِائَةَ اَلْفِ حَدِیْثٍ صَحِیْحٍ وَمِائَتَیْ اَلْفِ حَدِیْثٍ غَیْرِ الصَّحِیْحِ قَالَ: وَلَعَلَّ الْبُخَارِیُّ اَرَادَ بِالْاَحَادِیْثِ الْمُكَرَّرَةِ الْاَسَانِیْدِ وَالْمَوْقُوْفَاتِ

❶ ترجمان القرآن' منصب رسالت نمبر

فَرُبَّمَا عَدَّ الْحَدِيثَ الْمَرْوِيَّ بِإِسْنَادَيْنِ حَدِيثَيْنِ.) ❶

''یعنی امام بخاری جب لاکھوں احادیث کا ذکر فرماتے ہیں تو ان کی مراد مکرر اسانید اور موقوفاتِ صحابہ اور ان کے فتاویٰ وغیرہ سب ہوتے ہیں تکرارِ سند سے جب ایک متن بار بار مروی ہو تو اسے وہ متعدد احادیث تصور فرماتے ہیں۔''

اس کے بعد فرماتے ہیں:

(قِيلَ وَيُؤَيِّدُ أَنَّ هَذَا هُوَ الْمُرَادُ أَنَّ الْأَحَادِيثَ الصِّحَاحَ الَّتِي بَيْنَ أَظْهُرِنَا بَلْ وَغَيْرَ الصِّحَاحِ لَوْ تَتَبَّعْتَ مِنَ الْمَسَانِيدِ وَالْجَوَامِعِ وَالسُّنَنِ وَالْأَجْزَاءِ وَغَيْرِهَا لَمَا بَلَغَتْ مِائَةَ أَلْفٍ بِلَا تَكْرَارٍ بَلْ وَلَا خَمْسِينَ أَلْفًا.) ❷

یعنی ''اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ جو احادیث اس وقت ہمارے پاس موجود ہیں اُنہیں مسانید سنن اجزاء جوامع وغیرہ میں اگر پوری طرح تلاش کیا جائے تو ان کی تعداد صحیح اور غیر صحیح ملا کر بھی پچاس ہزار تک نہیں پہنچتی۔''

ایک اور شبہ کا حل

یہ شبہ کہ محدثین کے مخصوص شرائط کے ماتحت باقی جو کچھ بچا وہ سب غلط ہے یہ بھی لاعلمی اور جہالت کی کرشمہ سازی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ خود فرماتے ہیں:

(مَا تَرَكْتُ مِنَ الصِّحَاحِ أَكْثَرُ.) ❸

''صحیح بخاری سے جو روایات متروک اور نظر انداز ہوئی ہیں وہ بہت زیادہ ہیں۔''

صحیح بخاری یا صحیح مسلم کا انتخاب مخصوص شرائط کے ماتحت ہوا ہے اس کا مطلب نہ تو تمام صحیح احادیث کا استیعاب ہے اور نہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے سوا باقی سب احادیث غلط ہیں بلکہ ائمہ حدیث تصنیف وتدوینِ کتب کے وقت بعض شرائط ذہن میں رکھتے تھے۔ ان

---

❶ تدریب الراوی' فی شرح تقریب النواوی: ٣/٥٦ ـ قدر مافات الشیخین من الصحیح۔

❷ تدریب الراوی' فی شرح تقریب النواوی: ٣/٥٦ قدر مافات الشیخین من الصحیح۔

❸ تدریب الراوی' ٣/٥٥ لم یستوعبا الصح من الصحیح فی کتابھا ولا التزما۔

شرائط کے تحت جو صحیح احادیث ان کے معیار پر ان کی نظر میں پوری اتریں انہیں وہاں جمع کر دیا یہ بھی ممکن ہے کہ ان شرائط کے مطابق بھی کہیں ذہول ہو گیا ہو۔ مثلاً امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح مسلم میں اپنی شرط یہ بتائی ہے۔

(اِنَّمَا وَضَعْتُ هٰهُنَا مَا اَجْمَعُوْا عَلَيْهِ.) ❶

''میں نے صحیح مسلم میں وہ احادیث درج کی ہیں جن پر بلحاظِ صحت ائمہ حدیث کا اجماع ہوگا۔''

لیکن معلوم ہے کہ کئی مقامات پر یہ شرط قائم نہیں رہ سکی اور وہ ایسی حدیث بھی ذکر فرما گئے ہیں جن پر ائمہ حدیث کا بلحاظِ صحت اجماع نہیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

(اَحْفَظُ مِائَةَ اَلْفِ حَدِيْثٍ صَحِيْحٍ وَمِائَتَيْ اَلْفِ غَيْرِ الصَّحِيْحِ.) ❷

''مجھے ایک لاکھ صحیح حدیثیں یاد ہیں اور دو لاکھ غیر صحیح۔''

حالانکہ صحیح بخاری میں تقریباً چار ہزار حدیثیں ہیں اس لیے یہ خیال قطعاً غلط ہے کہ صحیح بخاری کے علاوہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تمام احادیث غلط اور غیر صحیح ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شرط کے مطابق نہیں۔

مستدرک حاکم، صحیح ابن حبان، صحیح ابن خزیمہ یہ سب کتابیں بشرطِ صحت تدوین وتصنیف کی صورت میں آئیں۔ ان پر بعض اعتراضات کے باوجود کافی ذخیرہ محدثین کے نزدیک صحیح ہے۔ البتہ اصُولِ خمسہ بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی میں صحاح کا کافی ذخیرہ آ گیا ہے لیکن استیعاب کا دعویٰ یہاں بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے علاوہ حدیث کی کتابوں میں بھی صحیح احادیث کا ذخیرہ موجود ہے۔ البتہ بعض جگہ کچھ ایسی مشکلات سامنے آ گئیں کہ وہاں صحیح اور ضعیف میں امتیاز کرنا کافی دقت طلب ہو گیا۔ طبرانی سیوطی، ہیثمی کی کتابوں میں جو ذخیرہ پایا گیا ہے اس میں چھان پھٹک کے لیے ماہرینِ فن کی ضرورت ہے۔

---

❶ تدریب الراوی ۳/ ۵۴ لم یستوعبا الصحیح فی کتابیھما ولاالتزما۔

❷ تدریب الراوی ۳/ ۵۶ قدرما فات الشیخین من الصحیح۔

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ میں محدثین اور کتبِ حدیث کے طبقات کی تقسیم اس طریقے سے فرمائی ہے کہ اگر حدیث کا طالب علم انہیں غور سے پڑھے تو اسے بہت کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔ [1]

ہمارے دور کے منکرینِ حدیث کی حیثیت فنِ حدیث کی اہمیّت کے لحاظ سے ایک ایسے شخص کی طرح ہے جو ایک مضبوط مکان کو نقب لگانا چاہتا ہے لیکن وہ مکان کے نہ اندرونی نقشہ سے واقف ہے نہ ہی وہ اس کی پیچ در پیچ راہوں سے آشنا ہے اس لیے وہ کبھی آتے گرفتار ہوتا ہے کبھی جاتے ہوئے۔ تاہم ان کے حوصلہ کی داد دینی چاہیے کہ پے در پے ناکامیوں کے باوجود انہوں نے حوصلہ نہیں ہارا۔ گو اس راہ میں ناکامی کے ساتھ ندامت بھی ہمیشہ دامن گیر رہی۔

جسٹس محمد شفیع فرماتے ہیں:

ایک غیر معقول بات

''پس یہ امر بالکل واضح ہے کہ قرآن پڑھنا اور سمجھنا ایک دو آدمیوں کا مخصوص حق نہیں۔ قرآن سادہ اور آسان زبان میں ہے۔ اسے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ یہ ایک ایسا حق ہے جو ہر مسلمان کو دیا گیا ہے اور کوئی شخص خواہ کتنا ہی فاضل یا عالی مقام کیوں نہ ہو وہ مسلمان سے قرآن پڑھنے اور سمجھنے کا حق نہیں چھین سکتا۔'' [2]

پھر فرماتے ہیں:

''اس دنیا میں چونکہ انسانی حالات اور مسائل بدلتے رہتے ہیں' اس لیے اس بدلتی ہوئی دُنیا کے اندر مستقل ناقابلِ تغیر و تبدل احکام و قوانین نہیں چل سکتے۔ قرآن مجید بھی اس عام قاعدے سے مستثنیٰ نہیں ہے۔'' [3]

ظاہر ہے یہ ارشادات اتنے اونچے مقام سے ہو رہے ہیں جہاں معقولیت اور دانش مندی کے سوا کوئی اُمّید نہیں رکھی جا سکتی لیکن اگر قرآن کی تفسیر اور تشریح کا حق ہر آدمی کو دے دیا

---

[1] حجة الله البالغة' باب طبقة كتب الحديث: ١/١٣٢-١٣٥' المبحث السابع۔

[2] ترجمان القرآن' منصب رسالت نمبر: ص٢٤٨۔

[3] ترجمان القرآن' جلد ٥٦ شمارہ ٦ منصب رسالہ نمبر: ص٢٤٧۔

جائے اور اس کے لیے کوئی معیارِ علم نہ رکھا جائے تو کیا قانون کے متعلق بھی اسی کشادہ دلی سے اجازت دی جائے گی چونکہ قانون کا تعلق عامۃ الناس سے ہے اس لیے قانون کے فہم اور توجہ کا حق چند قانون دانوں کو نہیں دیا جا سکتا جیسے اس کے لیے معقول وجہ نہیں کہ چند بوریا نشین یا ائمہ مساجد قرآن فہمی اور تفسیر کے حق پر قابض ہو جائیں اسی طرح کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ چند وکیل یا جج قانون فہمی کے حق پر قابض ہو جائیں۔

اگر قانون کے تحفظ کے لیے کوئی دلیل مل گئی تو اُمید ہے بلکہ یقین ہے وہ دلیل قرآن وسُنّت کی تشریح کے لیے بھی کار آمد ثابت ہوگی۔ اسی طرح اگر یہ صحیح مان لیا جائے کہ بدلتے ہوئے حالات میں مستقل قانون قبول نہیں کیا جا سکتا اس لیے قرآن کو بھی کسی وقت آپ کے سامنے سر بسجو دھونا ہوگا۔ تو پھر یہ فرمایا جائے کہ وحی الٰہی اور خدا کے علم کے التوا اور ذاتِ حق کی ہمہ دانی کا مطلب کیا رہا؟ انسانی قوانین اور الٰہی قوانین میں ما بہ الامتیاز کیا ٹھہرا؟ اس پر اس کے سوا ہم کیا عرض کر سکتے ہیں کہ ایاز! قدرِ خویش بشناس۔

منکرینِ سُنّت اور معترض ''مفکرین'' سے

منکرین سُنّت اور حدیث پر اعتراض کرنے والے حضرات سے گزارش ہے کہ فنِ حدیث کی حیثیت اتھاہ سمندر کی ہے۔ اُمت نے تقریباً تیرہ سو سال اس کی خدمت کی ہے اور مختلف راہوں سے کی ہے۔ ابن صلاح کی علوم الحدیث اور حاکم کی معرفت علوم الحدیث پر نظر ڈالیے۔ آپ کو اس فن کی خدمت میں تنوع نظر آئے گا اور حافظ بغدادی کی الکفایہ میں بھی علومِ حدیث کا کافی مواد ہے۔

ان متنوع خدماتِ حدیث کا نتیجہ یہ ہے کہ صدیوں کی عقیدت مندانہ خدمات اس کی پُشت پر ہیں۔ اس بلندی سے اسے نیچے لانے کے لیے فنی قابلیت ضروری ہے۔ اس کی باریکیوں اور نزاکتوں پر نظر رکھے بغیر تنقید کرنا خفت کا موجب ہوگا۔

آپ حضرات نے یہ شیوہ بنا رکھا ہے کہ ساری عمر انگریزی قانون اور انگریزی زبان پڑھتے ہیں پھر ملازمت کرتے ہیں' پھر ریٹائر ہوتے ہیں اور یہ آخری فرصت کی گھڑیاں جو آپ کو عبادت کے لیے قدرت نے عطا کی ہیں ان کو سنت پر اعتراض اور بحث کرنے میں

صرف کرتے ہیں اور اہلِ فن کی نظر میں مضحکہ بنتے ہیں۔

یا پھر اونچی کرسیوں سے اس شریف فن پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ حالانکہ آپ ایک خاص قانون کے ماہر ہیں علوم الحدیث سے واقف نہیں۔ کرسی کی آڑ میں یہ شکار مناسب نہیں۔

آپ اپنے مقام سے نیچے آیئے اور اہلِ فن کے ساتھ بیٹھ کر اس کی مشکلات اور اس کے آداب ولوازم اور پھر اس کے نتائج پر غور فرمایئے' پھر اگر آپ کا ضمیر مطمئن نہ ہو تو شرح صدر سے تنقید فرمایئے۔

بلاتی ہیں موجیں کہ طوفاں میں اُترو
کہاں تک چلو گے کنارے کنارے

ہمیں یقین ہے کہ اس فن کے آداب ولوازم کو جاننے کے بعد آپ نہ صرف یہ کہ اعتراض کے قابل نہیں رہیں گے بلکہ ان بوریانشینوں کی صفوں میں ایک مُناسب اضافہ ہوگا اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو آپ کے اعتراض معقول ہوں گے۔ ان میں کچھ وزن ہوگا اور سامعین کو کچھ فائدہ بھی پہنچے گا۔



جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث

ایک تنقیدی جائزہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

عرصہ ہوا مولانا مودودی صاحب نے ایک مضمون ''مسلک اعتدال'' کے عنوان سے لکھا جس پر عامۃ المسلمین میں مولانا اور اُن کی جماعت کے متعلق کچھ غلط فہمیاں پیدا ہوئی اور یہ قصہ اخبارات میں کافی دیر تک چلتا رہا کہ حُجیتِ حدیث اور سُنتِ رسول پر اعتماد کے متعلق جماعتِ اسلامی کا موقف کیا ہے؟ بحث ونظر کا یہ سلسلہ ابھی تھمنے نہیں پایا تھا کہ مولانا مودودی نے جیل سے تشریف لاتے ہی مختلف مقامات پر چند تقریریں فرمادیں۔ نیت کا علم تو اللہ کو ہے مگر ان تقاریر سے فضا میں تموّج اور تیزی سی آ گئی۔ جماعت اسلام کے جرائد نے اپنی قیادت کی حمایت میں جرأت اور تہور سے کام لے کر خاصہ گرمی پیدا کر دی۔ غالباً ان حالات سے متاثر ہوکر کسی اہلحدیث نے کچھ سوالات کئے جن کا جواب مولانا اصلاحی کے قلم سے اکتوبر ۵۵ء کے ترجمان القرآن میں شائع ہوا۔ مولانا اصلاحی کے نظریات مولانا مودودی سے چنداں مختلف نہیں۔ حدیث کے متعلق دونوں بزرگ قریباً ایک ہی طرح سے سوچتے ہیں۔

جماعت اہلحدیث کے احساسات کا ایک خاص مقام ہے اور قریباً ایک صدی سے جس نہج پر ان حضرات نے فنِ حدیث اور سُنت کی خدمت کی ہے اس کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔ جماعت اسلامی کا طریق فکر اس سے مختلف ہے اس لیے اہلحدیث کا اس سے ناگوار تاثر بالکل قدرتی تھا اور ایک گونہ تصادم اس کا طبعی نتیجہ۔ ان جوابات سے اہلحدیث سائل کی کہاں تک تسکین ہوئی؟ اس کا علم نہیں ہوسکا' لیکن میرے تاثرات یہ ہیں کہ ان جوابات سے نہ کوئی اہلحدیث مطمئن ہوسکتا ہے نہ عامۃ المسلمین، بلکہ خود مجیب بھی شائد مطمئن نہ ہوں۔

ذہنی انتشار

''مسلک اعتدال'' قریباً تیرہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ پورا مضمون پڑھ لینے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف علاّم جو کچھ لکھ رہے ہیں اس پر خود بھی مطمئن نہیں۔ پورے مضمون میں ذہنی انتشار نمایاں ہے۔ اس مضمون کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا حصہ

پہلے حصہ میں مولانا منکرین حدیث سے اتفاق فرماتے ہیں کہ ''احادیث ظنی تو ہیں اور ظنی چیز ثابت شدہ نہیں ہوتی لیکن کسی چیز کا ثابت شدہ ہونا یہ کب معنی رکھتا ہے کہ وہ ردّ کر دینے کے قابل ہو'' ❶

---

❶ معلوم نہیں مولانا کس زبان میں گفتگو فرما رہے ہیں؟ شرعی اصطلاح تو یہی ہے کہ غیر ثابت شدہ مسائل کو رد کر دیا جائے۔ پھر یہ ارشاد کہ ''ظنی چیز ثابت شدہ نہیں ہوتی'' اگر ظن بمعنی وہم ہے تو ارشاد درست ہے لیکن قرآن حکیم نے ظن کو وہم کے مرادف صرف اُس وقت فرمایا جب وہ حق کے مقابل ہو ﴿إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا﴾ [۱۰/یونس:۳۶] قرآن میں ظن حقیقتِ ثابتہ کے معنی میں استعمال ہوا:

① ﴿وَأَنَّا ظَنَنَّا أَنْ لَنْ نُعْجِزَ اللَّهَ فِي الْأَرْضِ وَلَنْ نُعْجِزَهُ هَرَبًا﴾ [۷۲/الجن:۱۲]

''یہ قطعی حقیقت ہے کہ ہم زمین میں نہ خداتعالیٰ کو عاجز کر سکتے ہیں اور نہ ہی اس کی بارگاہ سے بھاگ سکتے ہیں۔''

② ﴿الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلَاقُوا رَبِّهِمْ﴾ [۲/البقرہ:۴۶]

''انہیں یقین ہے کہ وہ اللہ سے ملیں گے۔''

③ ﴿وَظَنَّ أَنَّهُ الْفِرَاقُ﴾ [۷۵/القیامۃ:۲۸]

''اُسے یقین ہوتا ہے کہ اب جدائی کا وقت ہے۔''

④ ﴿أَلَا يَظُنُّ أُولَٰئِكَ أَنَّهُمْ مَبْعُوثُونَ﴾ [۸۳/المطففین:۴]

﴿وَظَنَّ أَهْلُهَا أَنَّهُمْ قَادِرُونَ عَلَيْهَا﴾ [۱۰/یونس:۲۴]

''کیا انہیں یقین نہیں کہ وہ اٹھائے جائیں گے۔''

''ان کو یقین ہو گیا کہ وہ اس پر قادر ہیں۔''

راغب نے ظن کے متعلق ایک قاعدہ ذکر فرمایا ہے:

(اَلظَّنُّ اِسْمٌ لِمَا يَحْصُلُ عَنْ اِمَارَةٍ وَمَتٰى قَوِيَتْ اَدَّتْ اِلَى الْعِلْمِ وَمَتٰى ضَعُفَتْ جِدًّا لَمْ يَتَجَاوَزْ حَدَّ التَّوَهُّمِ وَمَتٰى قَوِيَ اَوْ تُصُوِّرَ تَصَوُّرَ الْقَوِيِّ اِسْتُعْمِلَ مَعَهُ اَنَّ الْمُشَدَّدَةِ وَاَنْ الْمُخَفَّفَةِ) الخ مفردات القرآن: ص۳۲۰ مادہ ظ ن ن

ظن اس علم کا نام ہے جو علامات اور قرائن سے حاصل ہو۔ جب یہ قرائن پختہ ہوں تو ان سے علم و یقین حاصل ہوتا ہے، کمزور ہوں تو وہم سے کم نہیں، (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ❀❀)

اس لیے احادیث کو کلیۃً رد کر دینا درست نہیں۔ ارشاد ہے: مظنونات کو من حیث الکل قبول کر لینا جس درجہ کی غلطی ہے اسی درجہ کی غلطی من حیث الکل رد کر دینا بھی ہے۔'' [1]

مولانا کا مشورہ یہ ہے کہ منکرین حدیث کو پورے ذخیرہ کا انکار نہیں کرنا چاہئے۔ (میرا خیال ہے منکرین حدیث سے پرویز پارٹی شاید مولانا کی تجویز سے اتفاق کر لے) اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں کہ ''آحاد کو رد کرنے سے دین میں جامعیت نہیں رہے گی۔ قرآن سے اور متواتر احادیث سے اسلام کا مکمل نظامِ حیات نہیں مل سکتا، صرف اخبار آحاد ہی ہیں جو ہم تک ہدایات کا عظیم الشان ذخیرہ بہم پہنچاتی ہیں۔'' [2]

یہ اندازِ بیان کتنا ہی معذرت خواہانہ کیوں نہ ہو مگر درست ہے۔ طریق ادا میں کتنی مسکنت اور کمزوری ہو مگر مجارات مع الخصم کے طریق پر مولانا نے جو فرمایا مناسب ہے۔ طریق ادا سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر جو فرمایا کافی حد تک صحیح ہے۔

دوسرا حصہ

دوسرے حصہ میں مولانا ائمہ حدیث اور ان کی خدمات کی تعریف فرماتے ہیں۔

(❁❁ گزشتہ سے پیوستہ) جب یہ قرائن قوی ہوں یا ان کے قوی ہونے کا خیال ہو تو اَن کی ساتھ اَنْ مشددہ اور مخففہ استعمال ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ظن کو علی الاطلاق غیر ثابت شدہ کہنا قطعًا غلط ہے اور اس نظریہ پر جو نتائج مرتب ہوں گے وہ بھی غلط ہی ہوں گے۔ اصل حکم ان امارت اور قرائن پر ہوگا جن سے ظن حاصل ہوا۔

ائمہ حدیث کی اصطلاح میں ''ظن'' علم کے ایک خاص مرتبہ کا نام ہے۔ متواتر سے بدیہی علم حاصل ہوتا ہے۔ آحاد میں جب قرائن صدق موجود ہوں اور ان قرائن کے قوت وضعف کے پیش نظر جو علم حاصل ہوا سے وہ ظن سے تعبیر کرتے ہیں۔ ائمہ نے اس علم کے متعلق فرمایا کہ یہ موجب عمل ہے پھر جن ائمہ نے تواتر میں عدد کے علاوہ اوصاف رواۃ کو بھی ملحوظ رکھا ہے یا جن روایات کو تلقی بالقبول کا مقام حاصل ہو ان سے علم نظری کا حاصل ہونا بھی مسلّم ہے۔ گویا یہ ایسا ظن ہے جس سے علم نظری حاصل ہو سکتا ہے۔ مولانا غور فرمائیں آیا غیر ثابت شدہ چیز موجب عمل ہو سکتی ہے یا اس سے عمل نظری حاصل ہو سکتا ہے؟...... عام اہل قرآن ظن کو وہم کے مرادف سمجھ کر اُسے غیر ثابت شدہ تصور کرتے ہیں۔ مولانا نے ذہول یا مسامحت سے اسی غلط استعمال کی بنا پر ہر ظن کو غیر ثابت شدہ فرما دیا اور جب اس کے نتائج پر نظر پڑی تو غیر ثابت شدہ کو قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ صلت علی الاسد و بلت عن النقد۔ ائمہ فن کی اصطلاح کے مطابق ظن علم کے اس مرتبہ کا نام ہے جو بداہت سے کم ہو۔ علم نظری اور اس کے جملہ مراتب اس میں شامل ہیں۔ ان قرائن کی بنا پر محدثین نے قوۃ اور ضعف کے مراتب متعین فرمائے ہیں۔

[1] تفہیمات' ص ۳۰۵۔ [2] تفہیمات' مسلك اعتدال: ص ۲۸۸۔

حدیث کی حفاظت کے ذرائع کو بھی قرآن کی غیر معمولی حفاظت کے ذرائع کی طرح بے نظیر کہتے ہیں، اصولِ محدثین کی تعریف فرماتے ہیں لیکن اس پر بے اطمینانی کا اظہار فرماتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ ''وہ بہرحال تھے تو انسان ہی'' انسانی علم کے لیے جو حدیں فطرۃُ اللہ نے مقرر کر رکھی ہیں ان کے آگے تو وہ نہیں جا سکتے تھے۔ انسانی کاموں میں جو نقص فطری طور پر رہ جاتا ہے اس سے تو انکے کام محفوظ نہ تھے۔'' [1] اس کے بعد متبعین حدیث پر تنقید فرماتے ہیں کہ:

''ان (محدثین) کی نگاہ میں احادیث کے معتبر یا غیر معتبر ہونے کا جو معیار ہے ٹھیک ٹھیک اسی معیار کی ہم (اہلحدیث) بھی پابندی کریں۔ مثلاً مشہور کو شاذ پر، مرفوع کو مرسل پر اور مسلسل کو منقطع پر لازماً ترجیح دیں۔'' [2]

بالکل بجا، مگر سوال یہ ہے کہ تواتر کی صورت میں جو یقین کا سرمایہ موجود ہے وہ بھی تو آخر انسان ہی ہیں، ان کے لیے بھی فطری حدود متعین ہیں۔ اگر یہ تنقید درست ہے تو قرآن اور سُنّتِ متواترہ کے یقین کو بھی ظن ہی کے مرادف سمجھنا چاہئے۔ گویا انسان کی فطری حدود کے اندر یقین کا وجود ناپید ہے۔ مولانا کے ذاتی خیالات یقیناً یہ نہیں ہوں گے مگر ان کے استدلال کی انتہا یہی ہے۔ ائمہ حدیث اور ان کی مساعی اور فنِ حدیث کے متعلق مولانا نے جو کچھ ایک ہاتھ سے دیا تھا اسے دوسرے ہاتھ سے واپس لے لیا، بلکہ ان کے نزدیک انسانیت کی لغت میں یقین کا لفظ ایک بے معنی لفظ ہے۔

اصولِ حدیث کے متعلق اہلحدیث اور متبعین حدیث کی ترجمانی مولانا نے جس طرح فرمائی ہے وہ قطعاً غلط ہے۔ ائمہ حدیث اور متبعین حدیث نے کبھی یہ دعویٰ نہیں فرمایا کہ یہ اصُولِ تنقید آخری ہیں، ان پر اضافہ ناممکن ہے، بلکہ ہماری نظر میں اصول حدیث ایک متحرک فن ہے وہ بتدریج اس حد تک پہنچا جہاں وہ آج موجود ہے۔ اگر کسی معقول اصل کا اس میں اضافہ فرمایا جائے تو فن میں اس کی گنجائش ہے۔ البتہ یہ شکایت بجا ہے کہ آج تک اس میں اضافہ کی جو کوشش کی گئی اس کی بنیادیں از بس کمزور ہیں اور اسے اصول کی حیثیت سے قبول کرنا سخت مشکل ہے۔ ان میں تعمیر کے بجائے تخریب ہے۔ آپ نے اور آپ سے پہلے بھی بعض بزرگوں نے ''درایت'' کا نام لیا مگر اس کی اساسی حیثیت کیا ہے؟ اس کا تذکرہ نہ ان

---

[1] تفہیمات' ص ۳۱۸۔ [2] تفہیمات' ۲۹۰۔

حضرات نے کیا نہ آپ نے۔ بلکہ آپ خود بھی اس پر مطمئن نظر نہیں آتے۔

غرض حدیث اور فنِ حدیث کی مولانا نے جس قدر حوصلہ افزائی کی از راہِ عنایت کی تھی اور پھر اس کی عمارت آپ ہی کے مبارک ہاتھوں سے پیوند خاک بھی ہوگئی اور جناب ہی کے قلم سے منکرین حدیث کا کیس مضبوط ہوگیا۔(وَمَا هِيَ بِاَوَّلِ قَارُوْرَةٍ كُسِرَتْ.)

تیسرا حصّہ

اس حصہ میں مولاناؒ نے فقہائے اسلام کی بہت تعریف فرمائی، اُن کو حق دیا کہ محدثین کے اصول کا تقاضا چاہے کچھ ہو مگر فقہا کو حق پہنچتا ہے کہ وہ ضعیف پر عمل کریں، مرسل کو ترجیح دیں، منقطع کو قبول کریں۔ مولانا یہاں قادیانی شاعری کا لبادہ زیب تن فرماتے ہیں۔ فقیہ کا تعارف اس انداز سے کراتے ہیں کہ:

''اس کی روح روحِ محمدی میں گم ہو جاتی ہے، اس کی نظر بصیرت نبوی کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے، اس کا دماغ اسلام کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے [1]۔''

پھر فرماتے ہیں:

''اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد انسان اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلے کا مدار اسناد پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے، اس لیے کہ اس کی نظر اس افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت دیکھ لیتی ہے۔'' [2] الخ

فقہائے اسلام کے مقام کی رفعت میں کلام نہیں لیکن ''مسلک اعتدال'' کے آخری صفحات میں جو کچھ فرمایا گیا ہے قطعی بے دلیل ہے اور محض شاعری۔ معاملہ صرف طریق فکر کے اختلاف کا ہے، نہ کوئی ہیرا ہے نہ جوت۔ مگر یہ محل جو شاعرانہ پرواز سے تعمیر ہوا تھا اسے بھی بالآخر پیوند خاک فرماتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

''جو چیز چونکہ سراسر ذوقی ہے اور کسی ضابطہ کے تحت نہیں آتی، نہ آسکتی ہے اس لیے اس میں اختلاف کی گنجائش پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے اور آیندہ بھی رہے گی۔'' [3] الخ

[1] تفہیمات' ص ۲۹۶۔ [2] تفہیمات' ص ۲۹۶۔ [3] تفہیمات' ص ۲۹۶۔

پھر یہ ہیرے کی جوت کیسے ہوئی؟ یعنی فقہائے اسلام کا طریق فکر بھی ذوقی ہے کوئی اصول نہیں۔

اب کوئی بتائے ان تیرہ صفحات میں مولانا نے ہمیں کیا دیا اور کونسی اعتدال کی راہ بتائی؟ منکرین حدیث دریافت کرتے ہیں کہ حضرت نے اس قدر ملامت کے بعد ہمیں کیا عنایت فرمایا؟ آپ اور ہم میں نقطۂ امتیاز کیا ہے؟

مولانا اصلاحی صاحب

مولانا اصلاحی مستند اور پختہ کار عالم ہیں۔ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ ایسے صاحب فکر سے انہوں استفادہ فرمایا ہے۔ آپ نے اپنے ارشادات میں قریباً وہی سب کچھ فرمایا ہے جو مسلک اعتدال میں کہا گیا ہے۔ مگر ذہن اور خیالات کی پراگندگی کو الفاظ کی سطح پر نمایاں نہیں ہونے دیا۔ لیکن فضا کی گرمی اور اخبارات کی تیز تنقیدات سے ذہن متاثر ہے۔ بعض مقامات پر لہجہ خاصا تنگ ہوگیا ہے۔ طبعی متانت اور فطری سنجیدگی کے باوجود مولانا بعض ایسی چیزیں فرماگئے کہ اگر نہ فرماتے تو بہتر ہوتا۔ ایک متین آدمی کے لیے اسقدر نیچے آجانا کوئی اچھی مثال نہیں۔

ایک ضروری وضاحت

زیر قلم گزارشات سے مقصد کچھ اپنے مسلک کی وضاحت ہے اور کچھ ان بزرگوں کے ارشادات اور ان کے مضر اثرات کی نشاندہی' تاکہ یہ ظاہر ہوسکے کہ حدیث اور سنت کی حمایت میں وہ راہ صحیح ہے جسے جماعت اسلامی کی قیادت نے اختیار فرمایا، یا وہ مسلک درست ہے جس کی نشاندہی ائمہ حدیث اور سلفِ امت نے فرمائی ہے نیز اسلام کی وسعت اور ہمہ گیری ان حضرات کے طریق فکر سے ظاہر ہوتی ہے یا اہل حدیث کے طریق فکر سے جن مقاصد کی تحصیل اور تکمیل آپ حضرات برسوں سے فرمارہے ہیں اس کی کفالت اہل حدیث کا مسلک کرسکتا ہے یا آپ کے یہ محتاط اور منقبض خیالات۔

جہاں تک مولانا اصلاحی اور مولانا مودودی کی ذات کا تعلق ہے یا ان کی اصلاحی مساعی کا' میرے دل میں ان کے لیے پورا احترام ہے گزشتہ ایام میں بعض اخباری اندازِ تحریر سے فضا

میں جو تمازت پیدا ہو گئی تھی میں طبعًا اسے ناپسند کرتا ہوں۔ دین پسند جماعتوں کے تخاطب میں یہ ترشی کبھی نہیں ہونی چاہیے اور موجودہ ظروف واحوال تو اس کے لیے قطعًا ناساز گار ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دین پسند جماعتیں جس قدر بھی باہم دست و گریباں ہوں گی باطل کو اسی قدر فائدہ پہنچے گا۔

''مسلک اعتدال'' اور مولانا اصلاحی کے ارشادات پر کئی وجوہ سے گفتگو کی جاسکتی ہے لیکن میں نے کوشش کی ہے کہ زیرِ قلم گزارشات حدیث اور اس کے متعلقات تک محدود ہیں تاکہ اس موضوع پر ہم ایک دوسرے کو قریب سے سمجھ سکیں۔

''مسلک اعتدال'' آج سے کئی سال پہلے بھی پڑھا تھا، اب پھر پڑھا ہے اس میں نہ کوئی علمی اور فنی خوبی ہے اور نہ کوئی اصلاحی نکتہ۔ مولانا اصلاحی نے کئی سال کے بعد اس کی نوک پلک کچھ درست فرمانے کی کوشش فرمائی ہے۔ قصورِ علم کے اعتراف کے ساتھ عرض ہے کہ اس میں بھی اطمینان کا کوئی سامان نہیں اور بے حد مناسب ہوگا اگر یہ بے مقصد مضمون تفہیمات سے بالکل قلمزن کر دیا جائے۔

حدیث اور سُنت

ائمہ حدیث اور فقہا رحمہم اللہ نے حدیث اور سُنت کو خاص معانی میں بھی استعمال فرمایا ہے لیکن جہاں وہ اصول اور ادلہ کا ذکر فرماتے ہیں وہ انہیں ہم معنی اور مترادف سمجھتے ہیں۔ عنوان اور ابواب میں تو بعض اوقات ''خبر'' کا لفظ بھی استعمال فرماتے ہیں جو ان دونوں سے عام ہے مگر مقصد وہی ہوتا ہے جسے عرفِ عام میں سُنت یا حدیث کہا جاتا ہے منکرین حدیث اسی معنٰی سے حدیث کا انکار کرتے ہیں اور سُنت پر جرح اور اعتراض کرتے ہیں۔ اصولِ حدیث اور اصولِ فقہ کی مختصرات اور مطولات پر ایک نظر ڈالیے، وہ ان الفاظ کے مصطلح مفہوم میں نہ سکیڑ پیدا کرتے ہیں نہ اپنے موقف سے سرِ مو انحراف۔ شَكَرَ اللّٰهُ مَسَاعِيَهُمْ. لیکن مولانا اصلاحی صاحب نے سنت کے مفہوم کو بالکل سکیڑ دیا ہے۔

سُنّت ائمہ سنت کی نظر میں

1 (اَلسُّنَّةُ وَهِيَ تُطْلَقُ عَلٰى قَوْلِ الرَّسُوْلِ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَعَلٰى فِعْلِهِ وَالْحَدِيْثُ مُخْتَصٌّ بِقَوْلِهٖ) [1]

2 (يُطْلَقُ لَفْظُ السُّنَّةِ عَلٰى مَاجَاءَ مَنْقُوْلًا عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ مِنْ قَوْلٍ اَوْفِعْلٍ اَوْتَقْرِيْرٍ) [2]

3 (اَلسُّنَّةُ فِي عُرْفِ الْمُحَدِّثِيْنَ وَجُمْهُوْرِ اَهْلِ الشَّرْعِ كُلُّ مَاصَدَرَ عَنِ الرَّسُوْلِ ﷺ مِنْ قَوْلٍ اَوْفِعْلٍ اَوْ تَقْرِيْرٍ سَوَاءٌ صَدَرَ عَنْهُ بِاِعْتِبَارِهٖ رَسُوْلًا اَمْ بِاِعْتِبَارِهٖ اِنْسَانًا مِنَ الْبَشَرِ.) [3]

4 (اَلسُّنَّةُ اَمَّاشَرْعًا فَهِيَ قَوْلُ النَّبِيِّ ﷺ فِعْلُهٗ وَتَقْرِيْرُهٗ.) [4]

5 (اَمَّا السُّنَّةُ فَتُطْلَقُ فِي الْاَكْثَرِ عَلٰى مَا اُضِيْفَ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ مِنْ قَوْلٍ اَوْفِعْلٍ اَوْ تَقْرِيْرٍ فَهِيَ مُرَادِفَةٌ لِلْحَدِيْثِ عِنْدَ عُلَمَاءِ الْاُصُوْلِ.) [5]

6 (اَمَّا السُّنَّةُ فَهِيَ لُغَةً الطَّرِيْقَةُ وَاصْطِلَاحًا مُرَادِفَةٌ لِلْحَدِيْثِ بِالْمَعْنَى الْمُتَقَدِّمِ اَلَّذِيْ هُوَ كُلُّ مَا اُضِيْفَ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ) [6]

7 (وَالسُّنَّةُ هٰهُنَا مَاصَدَرَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ غَيْرَ الْقُرْآنِ مِنْ قَوْلٍ وَيُسَمَّى الْحَدِيْثُ اَوْفِعْلٍ اَوْتَقْرِيْرٍ.) [7]

8 (وَالسُّنَّةُ هِيَ الْمَرْوِيَّةُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَوْلًا وَفِعْلًا.) [8]

9 (وَالسُّنَّةُ مَاوَرَدَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ غَيْرَ الْقُرْاٰنِ اَوْ فِعْلٍ اَوْ تَقْرِيْرٍ.) [9]

10 (وَالسُّنَّةُ لُغَةً اَلْعَادَةُ وَشَرِيْعَةً مُشْتَرَكٌ بَيْنَ مَاصَدَرَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ

---

1 التوضیح والتلویح مع الحاشیة التوشیح'ص:٤٦١ الرکن الثانی۔

2 اصول الفقه للخضری بک' ٢٣٦ السنة۔ 3 فقه الاسلام'حسن احمد خطیب'ص٦٩۔

4 حصول المامول'٢٢۔ 5 توجیه النظر للجزائری'ص:٣ الفصل الاول فی بیان معنی الحدیث۔

6 لقط الدرر بشرح متن نخبة الفکر ص:٤۔ 7 القول المامول فی فن الاصول:ص٧٨۔

8 مختصر المنار لزین الدین الحبلی' ص:١٦ باب بیان اقسام السنه۔

9 قواعد الاصول'ص:٩١ الباب الثانی فی الادلة۔

مِنْ قَوْلٍ اَوْفِعْلٍ اَوْتَقْرِیْرٍ وَبَیْنَ مَاوَاظَبَ عَلَیْهِ النَّبِیّ ﷺ بِلَاوُجُوْبٍ) ❶

⓫ (وَالسُّنَّةُ لُغَةً اَلْعَادَةُ وَهٰهُنَا مَا صَدَرَعَنْ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ غَیْرَالْقُرْاٰنِ مِنْ قَوْلٍ اَوْفِعْلٍ اَوْتَقْرِیْرٍ کَذَافِی شَرْحِ الْمُخْتَصَرِ.) ❷

⓬ (اَلسُّنَّةُ هِیَ قَوْلُ الرَّسُوْلِ ﷺ اَوْفِعْلُهٗ.) ❸

⓭ (وَاِنَّمَا اِخْتَارَ لَفْظَ السُّنَّةِ دُوْنَ لَفْظِ الْخَبَرِ کَمَا ذَکَرَهٗ غَیْرُهٗ لِاَنَّ لَفْظَ السُّنَّةِ شَامِلٌ لِقَوْلِ الرَّسُوْلِ وَفِعْلِهٖ عَلَیْهِ السَّلَامُ.) ❹

⓮ (اَلسُّنَّةُ شَرْعًا مَانُقِلَ عَنْ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ قَوْلًا اَوْفِعْلًا اَوْ اِقْرَارًا عَلٰی فِعْلٍ) ❺

⓯ (اَلسُّنَّةُ تُطْلَقُ عَلٰی قَوْلِ الرَّسُوْلِ وَفِعْلِهٖ وَسُکُوْتِهٖ وَعَلٰی اَقْوَالِ الصَّحَابَةِ وَاَفْعَالِهِمْ الخ) ❻

⓰ (اَلسُّنَنُ تَنْقَسِمُ ثَلٰثَةَ اَقْسَامٍ قَوْلٌ مِنَ النَّبِیِّ ﷺ وَفِعْلٌ مِنْهُ عَلَیْهِ السَّلَامُ اَوْشَیْءٌ رَاٰهُ فَعَلِمَهٗ فَاَقَرَّ عَلَیْهِ.) ❼

⓱ (یُطْلَقُ لَفْظُ السُّنَّةِ عَلٰی مَاجَاءَ مَنْقُوْلًا عَنِ النَّبِیِّ ﷺ عَلَی الْخُصُوْصِ مِمَّا لَمْ یَنُصَّ عَلَیْهِ فِی الْکِتَابِ الْعَزِیْزِ.) ❽

اس مفہوم کا ذکر اہل علم کی مصنفات میں بکثرت موجود ہے۔ ائمۂ اسلام قرآن کے بعد سنت کو حجت شرعی سمجھتے ہیں اور سُنّت کا یہی مفہوم سمجھتے ہیں جو اوپر کے حوالوں میں مرقوم ہے۔ بعض تعریفات میں معمولی تغایر ہے، اس کا مفہوم اہل علم سمجھتے ہیں۔ ان تعریفات میں حدیث اور سُنّت کو ہم معنٰی ظاہر کیا گیا ہے اور آنحضرت ﷺ کے قول، فعل اور تقریر سب کو شامل سمجھا گیا ہے اور اس معنٰی سے اس کی حجیت محلِ نزاع ہے۔

❶ کتاب تعریفا للجرجانی' باب السین:ص ٥٤۔ ❷ مسلم الثبوت'ص:١٧٥ الاصل الثانی السنه۔ ❸ شرح البدخشی مناھج العقول شرح منھاج الوصول فی علم الاصول' الکتاب الثانی فی السنة:٢/٢٢٩۔ ❹ کتاب التحقیق شرح حسامی'ص١٤٧۔ ❺ نزھة الخاطر العاطر' ١/٢٣٦ الاصل الثانی من الادلة۔ ❻ نورالانوار'ص١٧٩۔ ❼ الاحکام فی اصول الاحکام' ٢/٦ الجزء الثانی فصل فی اقسام السنن۔ ❽ الموافقات فی اصول الاحکام' ٤/٤۔

ائمہ حدیث نے جو کتابیں سنت کے متعلق لکھی ہیں ان میں بھی قولی، فعلی اور تقریری سُنّت کا ذکر فرمایا ہے۔ تمام کتبِ سنن شاہد ہیں کہ ان میں سُنّت کو اسی متعارف اور مصطلح معنی میں ذکر فرمایا گیا ہے اور معلوم ہے کہ سُنّت کے یہ دفاتر اور ان کے مصنفین کا علم و فضل اُمت میں مسلم ہے۔ سنت کے متعلق ان کا نقطۂ نظر وہی ہے جس کا ذکر اُوپر کی عبارات میں ہوا۔

سنت مولانا اصلاحی کی نظر میں

جن حالات سے متاثر ہو کر مولانا اصلاحی نے ترجمان القرآن، اکتوبر ۵۵ء میں زیر تنقید مقالہ سُپردِ قلم فرمایا ہے، اہل حدیث، اہل قرآن وغیرہ جماعتیں سب مولانا کے پیش نظر ہیں اور ان سب پر مولانا اپنا تفوق ظاہر فرمانا چاہتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

''حدیث اور سنت کا دین میں اصلی مقام واضح کرنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ مختصر طور پر وہ فرق واضح کر دوں جو حدیث اور سُنت کے درمیان میں سمجھتا ہوں لیکن عام طور پر لوگ اس کو ملحوظ نہیں رکھتے۔'' [1]

حدیث تو ہر وہ قول یا فعل یا تقریر ہے جس کی روایت نبی ﷺ کی نسبت کے ساتھ کی جائے، لیکن سنت سے مراد نبی ﷺ سے صرف ثابت شدہ اور معلوم طریقہ ہے جس پر آپ ﷺ نے بار بار عمل کیا ہو، جس کی آپ نے محافظت فرمائی ہو، جس کے حضور عام طور پر پابند رہے ہوں۔'' [2]

مولانا کی یہ تعریف منطقی ہے نہ عرفی، تاہم:

1. مولانا نے جو فرمانا تھا کھل کر فرمایا ہے۔ ان کی نظر میں جو اہمیت سنت کو حاصل ہے وہ حدیث کو نہیں۔
2. اور یہ اہمیت بھی سُنت کے اُسی مفہوم کو حاصل ہے جسے مولانا نے اپنے لیے تعین فرمایا ہے یا جس کی تعلیم جماعت اسلامی کو دینا اس وقت پیشِ نظر ہے۔
3. اور یہ بھی ظاہر ہے کہ سنت کے متعلق یہ مولانا کی اصطلاح ہے، عام طور پر لوگ اسے ملحوظ نہیں رکھتے۔

---

[1] ترجمان القرآن' لاہور: اکتوبر ۱۹۵۵ء ص ۱۲۸۔۱۲۹۔

[2] ترجمان القرآن' لاہور: اکتوبر ۱۹۵۵ء ص ۱۲۹۔

٭ مولانا کی نگاہ میں کسی دوسرے مفہوم پر سنت کا اطلاق درست نہیں، سنت کا منطوق ''صرف'' یہی ہے (حالانکہ مولانا اس مفہوم میں پوری امت سے مختلف ہیں)

جہاں تک میرا یقین ہے مولانا نہ منکرِ حدیث ہیں نہ ان کو سنت سے انکار ہے لیکن مولانا نے جس انداز سے بحث کا آغاز فرمایا ہے اس سے چور دروازے کھل سکتے ہیں اور منکرین حدیث کو اس سے کافی مدد مل سکتی ہے۔

٭ مولانا نے سنت کی تعریف کو اس قدر سکیڑ دیا ہے کہ اس کا تعلق چند اعمال سے ہی ہوگا جن کا ثبوت آنحضرت ﷺ سے علی سبیل الاستمرار ہے جیسے نماز کے بعض ارکان، لیکن اقدارِ زکوٰۃ وغیرہ کے لیے شاید پھر خبر واحد ہی کا سہارا لینا پڑے۔

٭ ہزار دفعہ فرمایا جائے ''کہ اگر کوئی شخص اس (سنت) کو ماخذِ دین تسلیم نہیں کرتا تو میں اس کو مسلمان تسلیم نہیں کرتا'' سوال یہ ہے کہ اس ''سنت'' کی پہنائی ہے کہاں تک؟ اس کا احاطہ چند اعمال سے آگے نہیں بڑھے گا۔ پورا اسلام تو کسی دوسری جگہ ہی ثابت کرنا ہوگا پھر اس کے ادعا کی ضرورت ہی کیا ہے؟

٭ دعویٰ یہ ہے کہ اسلام زندگی کے تمام گوشوں میں رہنمائی کے فرائض انجام دیتا ہے لیکن جناب کی پیش کردہ تعریف کے لحاظ سے تو اس کا دائرہ اس قدر تنگ ہوگا کہ زندگی کے بعض اہم گوشے بھی شاید اس کی رہنمائی سے خالی رہیں۔ سیاسی اور معاشی امور میں رہنمائی تو بڑی بات ہے، عبادات اور معاملات میں بھی ہمیں اسلام کی رہنمائی سے محروم ہونا پڑے گا۔ اخبارِ آحاد کے ساتھ معتزلہ کی طرح اگر سوتیلی ماں کا سا سلوک جاری رہا تو جہاد، تقسیم غنائم، جزیہ، محاربات ایسے اہم مسائل اور اسی قسم کے اکثر بین الاقوامی مسائل میں ہم اسلام کی رہنمائی سے محروم ہو جائیں گے اور تکمیلِ دین ایک ایسا خواب ہو کر رہ جائے گا جس کی کوئی تعبیر نہیں۔ قرآنِ عزیز اور سنن متواترہ کے ساتھ اہل قرآن کی طرح اگر ضروری احکام کشید کرنے کی کوشش کی گئی تو استدلال کا جو انداز اختیار کرنا پڑے گا اس کی حیثیت سیاسی جوڑ توڑ سے زیادہ بہتر نہیں ہوگی۔

ادارہ طلوعِ اسلام کے بعد ادارہ ثقافت اسلامیہ

انکارِ حدیث کے بعد ملک میں دو جماعتیں آپ کے سامنے ہیں۔ ان کا طریق استدلال نمایاں ہے۔ ادارۂ طلوع اسلام کراچی اور ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور۔ ان میں اکثریت منکرین حدیث کی ہے، ان میں جو حضرات کھلے طور پر حدیث کا انکار نہیں کرتے ان کا ذہنی رجحان انکار ہی کی طرف ہے وہاں اسلام کے بنیادی حقائق کی تشریحات اس انداز سے کی گئی ہیں جس سے اسلام کے ارکان تک محفوظ نہیں رہ سکے۔ نہ نماز موجود ہے نہ روزہ، نہ حج ہے نہ زکوۃ نہ توحید سلامت ہے نہ رسالت، نہ قیامت ہے نہ جزا اور سزا۔ پورا اسلام قریباً دنیا پرستی کا دوسرا نام ہوگیا ہے۔ ملاحظہ ہو رسالہ ''اسلام کی بنیادی حقیقتیں'' مصنفہ خلیفہ عبدالحکیم۔ ''مقامِ حدیث'' از سید جعفر شاہ اور ''نظامِ ربوبیت'' از پرویز وغیرہ

یہ ہے کہ امام شافعی یا امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی حیثیت کے آدمی از اول تا آخر اسے روایت کریں۔ سنگین شروط کا نتیجہ معنیً انکار ہی ہوگا۔

(۱۲) اس تعریف کے مطابق صوم عاشوراء جو غالباً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی دفعہ رکھا، نماز تراویح جسے حضرت نے رمضان میں صرف تین دن با جماعت ادا فرمایا [1]۔ دعائے استفتاح کے مختلف صیغ جن پر مختلف اوقات میں عمل فرمایا ایسے ہی دوسری عملی سنتیں جن پر استمرار ثابت نہیں یا وہ زیرِ بحث ہے، اس تعریف میں کیسے شامل ہوں گی، ان کی سنیت سے انکار اس تعریف کے مطابق دشوار نہیں ہوگا۔

(۱۳) سنت کی تعریف میں بعض اہل علم کچھ قیود کے ساتھ عادات اور عبادات دونوں کو شامل سمجھتے ہیں، بعض صرف تعبدی امور ہی کو سنت میں داخل جانتے ہیں...... یہ بحث اپنی جگہ محل نظر و غور ہے...... لیکن مولانا کی تعریف اس باب میں بھی خاموش ہے۔ عاداتِ مستمرہ کو خارج کرنے کے لیے تعریف میں کوئی فصل نہیں۔ آپ کی اس تعریف کو زیادہ سے زیادہ اتنی

---

[1] **مسلم**، کتاب الصلاۃ :باب الترغیب فی قیام رمضان وھو التراویح، ۱۷۸٤؛ **موطا**، کتاب الصلاۃ فی رمضان باب الترغیب فی الصلاۃ فی رمضان : ۱/۷۲؛ **ابو داؤد**، کتاب (الصلاۃ)شھر رمضان باب فی قیام شھر رمضان، ۱۳۷۳؛ **النسائی** کتاب قیام اللیل و باب قیام شھر رمضان ۱٦۰۵؛ **التمھید**، کتاب الصلاۃ فی رمضان۔ باب الترغیب فی الصلاۃ فی رمضان، ۹۳۔

اہمیت دی جا سکتی ہے کہ اگر کوئی عمل ان شرائط سے ثابت ہو جائے تو وہ بھی سُنّت ہو گا۔

(۱۴) اصطلاحات کے تعین کا ہر شخص کو حق حاصل ہے لیکن ان کو ائمہ کی متعینہ اصطلاحات کی جگہ نہیں دی جا سکتی۔ مثلاً اگر کوئی یہ کہے کہ میرے نزدیک صلوٰۃ کا مفہوم ربوبیت کبریٰ ہے اور آخرت سے مراد یوم الحساب نہیں بلکہ اسی دنیا میں کل کی فکر اور زندگی میں مستقبل کی فکر ہے اور ملائکہ سے مراد قدرت کے وہ کرشمے ہیں جو اسی دُنیا میں انسان کے لیے مسخر فرمائے گئے ہیں، صوم سے مراد جذبات پر صرف انضباط اور کنٹرول ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اپنی جگہ یہ چیزیں کتنی ہی مفید کیوں نہ ہوں مگر اس سے صوم وصلوٰۃ ایمان بالآخرۃ اور ایمان بالملائکہ کے متعلق متعارف اور مصطلح مفہوم ثابت نہیں ہو گا۔ اسی طرح سُنّت کے متعلق ایک جدید اصطلاح کی حد تک تو اس پر غور ہو سکتا ہے لیکن وہ ما بہ النزاع مسئلہ جس پر گفتگو چل رہی ہے اس سے حل نہیں ہو گا۔ جہاں تک میرا خیال ہے مولوی احمد دین امرتسری قریباً اسی نقطۂ نگاہ سے اعمال متعارفہ اور معمول بہا سنن۔ آج سے صدیوں پیشتر سنت اور حدیث کی حمایت میں ہم جہاں کھڑے تھے اُس مقام سے ائمہ حدیث کے حملوں نے معتزلہ، خوارج اور دوسرے مبتدع فرقوں کو شکست پر شکست دی تھی اور ہماری اسلاف کی تعمیری اور تخریبی مساعی نے اہلِ بدعت کو ناکام بنا دیا تھا لیکن مولانا نے تعریف میں جو سکیڑ اور انقباض پیدا فرمایا ہے اس کا مطلب تو یہ ہو گا کہ ہم اپنے دعویٰ کے بہت سے حصوں سے خود ہی دست بردار ہو گئے۔ اگر ہماری ان فکری قیادتوں کی گریز پائی کا یہی حال رہا تو ہمیں اپنی شکست کا اعتراف کرنا چاہیے۔ ہم آحاد کے قیمتی ذخیرہ سے خود بخود دست کش ہو گئے۔ یہ غیر محتاط احتیاط قلتِ مطالعہ کا نتیجہ ہے یا جبن اور بزدلی کا؟ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنَ الْجُبْنِ۔ [1]

(۹) اس تعریف سے شاید وہ مقصد بھی حاصل نہ ہو جس کے لیے یہ سکیڑ اور انقباض اختیار کیا گیا۔ میرا خیال ہے کہ اہل قرآن سے پرویز پارٹی شاید وقتی طور پر کسی قدر الفاظ کے

[1] **بخاری**، کتاب الدعوات، باب التعوذ من غلبة الرجال رقم ٦٣٦٣؛ **مسلم**، کتاب الذکر والدعاء، باب الدعوات والتعوذ: رقم ٢٨٧١؛ **ابوداؤد**، کتاب الوتر، باب فی الاستغاثة رقم: ١٥٤٠؛ **الترمذی**، کتاب الدعوات، باب فی دعاء النبی وتعوذہ فی دبر کل صلاة: ٢٥٦٧؛ **النسائی**، کتاب الاستغاثه، باب الاستغاثه من سوء الکبر: ٥٤٩٦۔

ہیر پھیر سے آپ کے ساتھ اتفاق کرے، غالباً ان کے انکارِ حدیث اور آپ کے اقرارِ حجیت سنت پر، اس تعریف کے بعد کوئی نمایاں اثر نہیں پڑتا۔ کچھ اعتباری سا امتیاز رہ جائے گا۔

مقامِ بحث سے انحراف

(۱۰) اس قسم کی تعریف مقامِ بحث سے ایک گونہ انحراف ہے۔ محلِ نزاع سُنت کا وہی مفہوم ہے جس کا ذکر مختلف اہل علم کی مصنفات سے اُوپر کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے سنت کی حمایت کا وہ مقام بدل لیا جس پر ہم قرونِ خیر سے آج تک قائم تھے۔ اس انحراف اور حیدۃ کی جناب سے اُمید نہ تھی۔

(۱۱) آنحضرت ﷺ کا عمل اور اس پر استمرار ثابت کرنے کے لیے تواتر کا ذخیرہ تو بہت ہی مختصر ہے، اگر آحاد پر اعتماد کیا جائے تو مولانا کے نقطۂ نظر سے اثبات الظن بالظن ہوگا اور بصورت اول زندگی کے عام گوشوں میں اس کا نتیجہ انکارِ حدیث ہوگا کیونکہ دفاتر سنت میں جو کچھ ملتا ہے یہ تعریف اس پر صادق نہیں آتی۔ نیز مولانا کی یہ تعلیق ایسی ہے جیسے کوئی کہے کہ میں سنت کو حجتِ قطعی سمجھتا ہوں لیکن سنت کی تعریف کا انکار نہیں کرتے تھے، اذان، نماز، نکاح، میں اسی متعارف طریق پر عمل کرتے تھے۔ برھان القرآن اور ان کی تفسیر میں اس کا ذکر بار بار ملتا ہے، حالانکہ مولوی احمد دین مسلمہ طور پر منکر حدیث تھے۔ امید ہے مولانا اس طریق بحث پر نظر ثانی فرمائیں گے کیونکہ اس انحراف سے اصل مسئلہ حل نہیں ہوگا۔

اثباتِ سُنّت کے طریقے

سنت کی تعریف کے بعد مولانا نے فرمایا کہ سُنت چار طریق سے ثابت ہو سکتی ہے (۱) عملی تواتر (۲) اہلِ مدینہ کا تعامل (۳) خلفائے راشدین کا عمل (۴) آحاد۔

خبر متواتر اور تواتر عملی میں بھی فرق ہے مگر اس وقت اس بحث کی ضرورت نہیں۔ تواتر کی حجیت مسلم ہے جو سُنّت تواتر سے ثابت ہو وہ بہر حال ثابت شدہ ہے لیکن تواتر سے کس قدر سنن ثابت ہو سکیں گی اس کا مختصر تذکرہ پہلے ہو چکا ہے اور آئندہ بھی ہوگا۔

احادیث پر گفتگو سے قبل تعاملِ اہل مدینہ اور سنتِ خلفائے راشدین کا معاملہ سامنے

آتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں ہم تک اسناد اور روایت کے ذریعہ سے ہی پہنچیں گی جن میں زیادہ تر آحاد ہیں اس لیے اس کا مقام اخبار آحاد سے بھی فروتر ہونا چاہیے۔ آحاد کی ظنیت اگر شبہات کا سبب بن سکتی ہے تو یہاں بھی ظن ہی ظن ہے۔ مرفوع اور صحیح آحاد سے گھبرانا اور اہل مدینہ کے تعامل سے استدلال معقول معلوم نہیں ہوتا۔ فَرَّ مِنَ الْمَطَرِ وَقَامَ تَحْتَ الْمِيْزَابِ والا معاملہ ہو جائے گا۔

مولانا نے اہل مدینہ کے کیس کو اپنے الفاظ میں بیان فرمایا کہ مدینہ منورہ تمام بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم کا مرکز تھا۔ زندگی کے مختلف معاملات میں صحابہ رضی اللہ عنہم جو کچھ کرتے تھے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اسے سنت کا ہم مرتبہ سمجھتے ہیں کیونکہ ایسے وقت میں صحابہ رضی اللہ عنہم سنت سے کیونکر الگ ہو سکتے ہیں، الخ مختصراً اور نتیجہ کے طور پر فرماتے ہیں:

''میں مالکیہ کے اس نقطۂ نظر کو قابل لحاظ سمجھتا ہوں۔''

(۱) موالک کی جس قدر کتابیں میری نظر سے گزری ہیں وہ لوگ اہل مدینہ کے عمل کو سنت کہنے کی جرأت نہیں کرتے، وہ جانتے ہیں کہ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اثبات کے لیے صحیح راہ سند ہے، شہریت کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ آجکل سند کے متعلق جن خطرات کا اظہار کیا جاتا ہے اس وقت یہ خطرات موجود نہ تھے۔

(۲) امام مالک ۹۳ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے اور ۱۷۸ھ کے قریب آپ نے انتقال فرمایا اور عام طور پر کبار صحابہ رضی اللہ عنہم ۳۰ھ سے پہلے ہی دینی خدمات کے سلسلہ میں عراق، شام، فارس وغیرہ مفتوحہ ممالک کی طرف تشریف لے جا چکے تھے۔ دار الخلافہ ہونے کی وجہ سے مدینہ میں علوج کی کثرت ہو گئی تھی جو دینوی مقاصد کے لیے مدینہ کو قریباً اپنا مسکن بنا چکے تھے۔ شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ اور بعد کے واقعات اور حوادث کا ایک سبب اہل الرائے اور کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کی عدم موجودگی بھی تھی۔ ان حالات میں اہل مدینہ کے عمل کو کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی بلکہ قرین قیاس تو یہ ہے کہ اس وقت کے عمل کو کوئی اہمیت نہ دی جائے۔

(۳) تمام دنیا کے لیے مدینہ ہو یا کوفہ، سنت ہی صحتِ عمل کی کسوٹی ہے۔ اب سنت کے لیے کسی شہر کو معیار قرار دینا معقول بات معلوم نہیں ہوتی۔ سنت اگر دیانتاً حجت ہے تو کسی

شہر یا کسی فرد کا عمل اس کے لیے بنیاد نہیں ہوسکتا۔ گھوڑا تانگے کے پیچھے نہیں جوتا جاسکتا۔

(۴) کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کا یہی طریقہ تھا کہ سنتِ صحیحہ مل جانے کے بعد اپنے عمل کو بدل دیتے اور اپنی روش پر اصرار نہیں فرماتے تھے اس لیے اگر بالفرض صحابہ اس وقت مدینہ میں موجود بھی ہوتے تو بھی سنت ان پر حجت ہوتی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے: ''كَيْفَ اَتْرُكُ الْخَبَرَ لِاَقْوَالِ اَقْوَامٍ لَوْ عَاصَرْتُهُمْ لَحَاجَجْتُهُمْ بِالْحَدِيْثِ [1] ''میں ان لوگوں کی اطاعت کیونکر کرسکتا ہوں اگر میں اس وقت موجود ہوتا تو سنت کے اعتماد پر اُن سے بحث کرتا۔''

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: وَالسُّنَّةُ هِيَ الْمِعْيَارُ عَلَى الْعَمَلِ وَلَيْسَ الْعَمَلُ مِعْيَارًا عَلَى السُّنَّةِ [2] ۔ ''سنت معیار ہے کسی کا عمل معیار نہیں۔''

(۵) اصل مستند چیز سنت ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم جہاں گئے ان کے پاس علم تھا اور اُنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل کی تلقین فرمائی، عجیب بات ہے کہ جب یہ حضرات مدینہ میں ہوں تو یہ علم مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حجت ہو، لیکن جب یہ علم کوفہ یا شام میں چلا جائے تو اس کی حجیت محلِ نظر ہو جائے۔ وَالْجُدْرَانُ وَالْمَسَاكِنُ وَالْبِقَاعُ لَا تَاثِيْرَ لَهَا فِي تَرْجِيْعِ الْاَقْوَالِ وَاِنَّمَا التَّاثِيْرُ لِاَهْلِهَا وَسُكَّانِهَا [3] اینٹوں اور مکانات کو کسی بات کی ترجیح میں کیا دخل ہوسکتا ہے، اس کا تعلق تو وہاں کے رہنے والوں سے ہی ہونا چاہیے'' علوم صحابہ رضی اللہ عنہم اور سنن نبویہ جہاں ہوں حجت ہوں گی۔

(۶) مدینہ میں بھی اہل علم باہم اختلاف فرماتے تھے مؤطا میں مالک رحمۃ اللہ علیہ نے خود ان اختلافات کا ذکر فرمایا۔ اس صورت میں بعض اہل مدینہ کے ارشادات دوسروں پر کیونکہ حجت ہوں گے اور مولانا سنت ثابت کرنے کے لیے کن اقوال کو معیار قرار دیں گے۔ موالک کے اس اصول کا لحاظ کیسے کیا جائے گا جب دونوں طرف اہل مدینہ موجود ہوں۔

اہل مدینہ اور ترکِ سُنّت

(۱۷) اہل مدینہ بعض اہم سنتوں کو ترک کر چکے تھے مثلاً: (۱) ہاتھ باندھنا موالک میں رائج نہیں وہ کھلے ہاتھوں نماز ادا کرتے ہیں۔ (۲) موالک سلام صرف ایک طرف پھیرتے

---

[1] الاحکام للآمدی' المسالہ السادسہ: ۲/۱٦۵۔

[2] ' [3] اعلام الموقعین' ۲/۳٦۱ ،الکلام علی عمل اهل المدینة۔

ہیں، جمہور ائمہ کا مذہب ہے سلام دونوں طرف ہونا چاہیے (۳) مالکی نماز میں بسم اللہ پڑھنا ہی پسند نہیں کرتے (۴) رفع الیدین ایسی معروف سنت موالک میں معمول بہا نہیں (۵) تکبیرات میں جہر کا رواج مدینہ میں نہیں رہا تھا (۶) دعائے استفتاح بالکل ترک کی جا رہی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تعلیم کے لیے عرصہ تک اسے جہر فرمایا (مسلم) (۷) موالک میں رواج ہے کہ وہ صبح کی اذان وقت سے پہلے کہنا پسند کرتے ہیں، حالانکہ سنتِ صحیحہ اس کے خلاف ہے، اذان وقت ہی کے اظہار کا ذریعہ ہے (۸) مسجد میں جنازہ درست ہے لیکن موالک اسے جائز نہیں سمجھتے، ابن حزم [1] اس قسم کے بیسیوں مسائل ذکر کیے ہیں جن میں اہل مدینہ کا عمل سنت کے خلاف ہے یا موالک ان سنن کے پابند نہیں جن کا مدینہ منورہ میں عرصہ تک رواج رہا۔ اب دو ہی رائیں ہوسکتی ہیں یا مالک خود اہل مدینہ کے عمل کو حجت نہیں سمجھتے تھے یا اہل مدینہ کا عمل سنت کے مطابق نہ تھا۔

(۸) ممالک اور شہروں کے اعمال اور عادات میں حکومت کو جہاں تک دخل ہے اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مدینہ میں جہاں خلفائے راشدین اور ائمہ ہدیٰ کا اثر رہا وہاں فاسق وفاجر حکام کا بھی اثر رہا۔ حافظ ابن حزم لکھتے ہیں کہ ''زمانۂ خیر کے بعد مدینہ میں عمرو بن سعید، حجاج بن یوسف، طارق، خالد بن عبداللہ، قسری، عبدالرحمٰن بن ضحاک، عثمان بن حیان مری ایسے فاسق اور فاجر بادشاہوں کا دور رہا اور ان کے اخلاقی اثرات اور وحشت خیز بدعات سے بھی مدینۃ الرسول متاثر ہوا۔ [2] امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں مدینہ اس ملی جلی تہذیب کا مظہر تھا۔ معلوم نہیں مولانا موالک کے نقطۂ نظر کو کہاں تک قابلِ لحاظ سمجھتے ہیں۔

(۹) ایک صدی کے مختلف اثرات کے بعد مولانا اہل مدینہ کے عمل کو اس وہم یا ظن کی بنا پر سنت کی اساس قرار دیتے ہیں کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے ماخوذ ہوگا اور سنتِ صحیحہ سے اس لیے گھبراتے ہیں کہ خبر واحد ظنی ہے۔ اوہام وظنون کو علوم پر ترجیح ہماری سمجھ میں

---

[1] الاحکام فی اصول الاحکام' ابن حزم: ۲/۲۲۳۔ ۲۳۳، ۱/۲۲۹ تا ۲۵۳؛ فصل فی ابطال الحدیث' بعمل اہل المدینة وابطال احتجاجھم بعملھم واعلام الموقعین ۲/۳۷۔۳۷۷؛ فصل العمل الذی طریقه الاجتہا د۔

[2] الاحکام' لا بن حزم الجزء الثانی فصل فی ابطال ترجیح الحدیث بعمل اہل المدینہ ۱/۲۴۶۔

نہیں آئی اور نہ ہی مولانا ایسے فہیم آدمی سے اس کی امید ہونی چاہیے۔ صلت علی الاسد و بلت عن النقد کی مثال اس سے زیادہ اور کیا ہوگی۔ مولانا نے کس سادگی سے فرمادیا:

''اس طریقہ سے معلوم شدہ سنت کو اُس علم سنت پر ترجیح دی گئی جو اخبار آحاد سے حاصل ہو۔''

مدینہ کے نام پر جذباتی اپیل تو کی جاسکتی ہے، علم و درایت کی دنیا میں اُس کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔

(۱۰) حقیقت یہ ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ خود بھی اہل مدینہ کو یہ اہمیت نہیں دیتے جو اُسے مولانا دے رہے ہیں۔ وہ سنت صحیحہ کو اہل مدینہ کے عمل سے رد کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ اگر ان کی نظر میں یہ عمل اس قدر اہم ہوتا تو وہ ہارون الرشید کی مؤطا مالک کے متعلق پیش کش فوراً منظور فرمالیتے۔

اِنَّهُ شَاوَرَ مَالِكاً فِي اَنْ يُعَلِّقَ الْمُوَطَّا فِي الْكَعْبَةِ وَيَحْمِلَ النَّاسَ عَلٰى مَافِيْهِ فَقَالَ: لَاتَفْعَلْ فَاِنَّ اَصْحَابَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اِخْتَلَفُوْافِي الْفُرُوْعِ وَتَفَرَّقُوْا فِي الْبُلْدَانِ وَكُلُّ سُنَّةٍ مَضَت قَالَ وَفَّقَكَ اللّٰهُ يَا اَبَاعَبْدِ اللّٰهِ.[1]

خلیفہ ہارون نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے مشورہ کیا کہ مؤطا کو ملک کا قانون قرار دے کر کعبہ میں لٹکا دیا جائے تاکہ لوگ اس کے اتباع پر مجبور ہوں، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: صحابہ رضی اللہ عنہم کا فروع میں اختلاف تھا اور وہ مختلف ممالک میں پھیل گئے جو کچھ ان سے منقول ہے سب سُنّت ہے۔ ہارون نے معاملہ سمجھ کر فرمایا، اللہ تمہیں خیر کی توفیق دے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کے علوم کو سنت سمجھتے ہیں۔ علم مدینہ میں ہو یا کسی دوسرے شہر میں وہ اہل مدینہ کے علم کو سُنّت کی بنیاد نہیں سمجھتے، مؤطا میں عمل اہل مدینہ کا ذکر ترجیح اور تائید کے لیے ہے، اصل دلیل وہاں بھی سُنّت ہی ہے جس کا ثبوت اُسی طریق سے

---

[1] **اعلام الموقعین**' الكلام على عمل اهل المدينة: ۲/۳۶۳ـ۳۶۴؛ **حجة الله البالغه**' باب اسباب اختلاف مذهب الفقهاء ۱'۱۴۵؛ **مفتاح السعادة**' للطاشكبرى: ۱/۸۷؛ **الاحكام**' لا بن حزم الجزء الثانى: ۱/۶۴۴ـ فصل فى ابطال ترجيح بعمل اهل المدينه واحتجاج بعملهم

ہوگا جو محدثین میں متعارف ہے۔ مولانا نے جس انداز سے اہل مدینہ کے عمل کا ذکر فرمایا ہے متاخرین موالک یا مولانا نے ایسے وکلا جو مقام چاہیں اُسے عنایت فرمائیں، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ پر اس کی ذمہ داری نہیں ڈالی جاسکتی۔ امام قطعاً اس کے حق میں نہیں کہ اہل مدینہ کے عمل سے سنتِ صحیحہ کو رد کیا جائے۔ یہ ایسی وکالت ہے جسے مؤکل پسند نہیں کرتا۔

(۱۱) بقول امام ابن حزم تین سو کے قریب اہل علم مدینے سے کوفہ اور ان اطراف میں آباد ہوگئے اور اسی کے پس وپیش شام میں، اور ان کی یہ ہجرت محض دینی اور تبلیغی ضرورتوں کے پیش نظر تھی، اس ایثار کی یہ کتنی سخت سزا ہوگئی کہ ان کا عمل نہ حجت ہے نہ سنت کے لیے اساس، اور بعض دوسرے حضرات جو دینی یا دنیوی ضرورتوں کے ماتحت مدینہ میں آباد ہوگئے اُن کے اعمال سنت نبوی کے لیے کسوٹی قرار پائے اگر وطنی عصبیت کا دین میں یہ مقام ہو تو علم ودانش کی کیا قدر و قیمت رہ گئی۔ ؎

فَمَا حُبُّ الدِّيَارِ شَغَفْنَ قَلْبِيْ وَلٰكِنْ حُبُّ مَنْ سَكَنَ الدِّيَارَا

(۱۲) اگر انسانی اعمال کو محض شرف وطینت کی بنا پر احادیث صحیحہ اور اخبار آحاد پر بے اعتمادی کا ذریعہ بنایا جائے تو انکارِ حدیث کے لیے ایک خطرناک باب کھل جائے گا۔ ﴿ فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ ﴾ [1]

(۱۳) اس سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا کہ غیر مدنی صحابہ کے پاس بھی علوم نبویہ کے ذخائر موجود تھے اور ان میں بعض ایسے بھی تھے جو اہل مدینہ کے پاس نہیں تھے۔ اس صورت میں اگر حدیث پر عمل کیا جائے تو اہل مدینہ کے عمل کی حیثیت کیا رہی؟ اور اگر اہل مدینہ کے عمل کو ترجیح دی جائے تو منکرین سُنّت نے آخر کیا جُرم کیا؟ اس اصول سے حجیتِ حدیث کے مسلک کو مدد ملی یا انکارِ حدیث کی تائید ہوئی؟ اس کا فیصلہ مولانا ہی فرماسکتے ہیں۔

(۱۴) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے مؤطا میں چند مقامات پر اہل مدینہ کے عمل کا ذکر فرمایا ہے ان کا اپنا انداز ترجیح کی حد تک ہے، الزام وحجت نہیں بلکہ بعض مقامات پر تو یہ تذکرہ صرف اظہارِ واقعہ کے طور پر آیا ہے۔ حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ مؤطا کی سرکاری حیثیت کے متعلق ہارون الرشید کی تجویز اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے انکار کے بعد فرماتے ہیں:

---

[1] ۲۲/الحج: ٤٦۔

وَهٰذَا يَدُلُّ عَلٰى اَنَّ عَمَلَ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ لَيْسَ عِنْدَهٗ حُجَّةً لِجَمِيْعِ الْاُمَّةِ وَاِنَّمَا هُوَ اِخْتِيَارٌ مِنْهُ لِمَارَاٰى عَلَيْهِ الْعَمَلَ وَلَمْ يَقُلْ قَطُّ فِيْ مُوَطَّاهِ وَلَا غَيْرِهٖ لَا يَجُوْزُ الْعَمَلُ بِغَيْرِهٖ بَلْ يُخْبِرُ اِخْبَارًا مُجَرَّدًا اَنَّ هٰذَا عَمَلُ اَهْلِ بَلَدِهٖ فَاِنَّهٗ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ وَجَزَاهُ عَنِ الْاِسْلَامِ خَيْرًا اِدَّعٰى اِجْمَاعَ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ فِيْ نَيِّفٍ وَاَرْبَعِيْنَ مَسْئَلَةً ❶

''اس سے ظاہر ہے کہ اہل مدینہ کا عمل حجت نہیں، نہ امت پر ہی اُسے قبول کرنا ضروری ہے بلکہ مطلب صرف ایک واقعہ کا اظہار ہے۔ اہل مدینہ کے اجماع کا ذکر امام نے قریباً چالیس مواقع پر فرمایا ہے۔''

سُنّت سازی کی توجیہ غالبًا مولانا نے کسی مالکی کے بیان سے فرمائی یا اپنی ہی درایت سے اسے جنم دے دیا، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔

مولانا اصلاحی گو اہل حدیث نہیں لیکن وہ کھلے ذہن سے سوچنے کے عادی ہیں۔ اگر وہ اعلام الموقعین اور احکام ابن حزم ❷ ملاحظہ فرمائیں تو وہ راقم سے اتفاق فرمائیں گے۔ (انشاءاللہ)

اہل مدینہ کے عمل کے اجزائے ترکیبی

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ اہل مدینہ کے عمل کا پس منظر ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

كَانَ بِحَسْبِ مَنْ فِيْهَا مِنَ الْمُفْتِيْنَ وَالْاُمَرَاءِ وَالْمُحْتَسِبِيْنَ عَلَى الْاَسْوَاقِ وَلَمْ تَكُنِ الرَّعِيَّةُ تُخَالِفُ هٰؤُلَاءِ فَاِذَا اَفْتَى الْمُفْتُوْنَ نَفَذَهُ الْوَالِيْ وَعَمِلَ بِهِ المحتسب وَصَارَ عَمَلًا فَهٰذَا هُوَ الَّذِيْ لَا يُلْتَفَتُ اِلَيْهِ لَا عَمَلُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَخُلَفَائِهٖ وَالصَّحَابَةِ فَذَاكَ هُوَ السُّنَّةُ فَلَا يُخْلَطُ اَحَدُهُمَا بِالْاٰخَرِ فَنَحْنُ لِهٰذَا الْعَمَلِ اَشَدُّ تَحْكِيْمًا وَلِلْعَمَلِ الْاٰخَرِ اِذَا خَالَفَ السُّنَّةَ اَشَدُّ تَرْكًا

---

❶ اعلام الموقعین' ۲/۳٦٤، الكلام على عمل اهل المدينه

❷ اعلام الموقعین' ۲/۳٦٤ الكلام على عمل اهل المدينه؛ الاحكام لابن حزم' ۱/۲۲۹ تا ۲۵۳، فصل فى ابطال ترجيح الحديث بعمل اهل المدينة وابطال الاحتجاج بعملهم

وَبِاللّٰهِ التَّوْفِيْقُ. ❶

خلفائے راشدین اور صحابہ کا دور گزرنے کے بعد اہل مدینہ کا عمل کیا تھا۔ مفتی کا فتویٰ، امیر کا حکم اور کوتوال کا احتساب، رعیت اسکی مخالفت نہیں کرتی تھی۔ لیکن یہ قطعًا قابل توجہ نہیں، آنحضرت ﷺ خلفا اور صحابہ کا عمل تو سُنّت ہے۔

''ہم ان کا فیصلہ قبول کرتے ہیں اور اس کے ساتھ دوسری کوئی چیز غلط نہیں کرنا چاہتے اور ان کے سوا جو عمل سنت کے خلاف ہو اس کا حتمًا انکار کرتے ہیں۔''

اس کے بعد حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے ایسی سنتوں کا ذکر فرمایا جو خلفا اور صحابہ کے وقت موجود تھیں لیکن موالک نے ان پر عمل ترک کر دیا۔ ❷

یہی تذکرہ حافظ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ اس طرح فرماتے ہیں:

''یہ زمانۂ خیر تو گزر گیا۔ اس کے بعد عمرو بن سعید اور حجاج بن یوسف ایسے فاسق اور ظالم بھی مدینہ کے والی بنے اور عمرو بن حزم اور عمر بن عبدالعزیز ایسے صالح اور نیک بھی' اور اہل مدینہ کا عمل ان کے اثرات کا دوسرا نام تھا''مختصراً''۔ ❸

مصر بھی آج کل علم ''درایت'' کا گہوارہ ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے اہل مدینہ کے عمل کے متعلق ایک مصری عالم کی رائے بھی سُن لیجئے۔ شیخ حسن احمد الخطیب فرماتے ہیں:

قَالُوْا اِنَّ عَمَلَ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ كَعَمَلِ غَيْرِ هِمْ مِنْ اَهْلِ الْاَمْصَارِ فَلَا فَرْقَ بَيْنَ عَمَلِهِمْ وَعَمَلَ اَهْلِ الْعِرَاقِ وَالشَّامِ وَالْحِجَازِ وَاِنَّمَا الْعِبْرَةُ بِالسُّنَّةِ فَمَنْ كَانَتْ مَعَهُمْ فَهُمْ اَهْلُ الْعَمَلِ الْمُتَّبِعِ وَكَيْفَ يَكُوْنُ عَمَلُ بَعْضِهِمْ حُجَّةً عَلٰى بَعْضٍ اِذَا اِخْتَلَفَ عُلَمَاءُ الْمُسْلِمِيْنَ وَقَدْ اِنْتَقَلَ اَكْثَرُ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الْمَدِيْنَةِ وَتَفَرَّقُوْا فِي الْاَمْصَارِ وَاَكْثَرُ عُلَمَاءِ هِمْ صَارُوْا اِلَى الْكُوْفَةِ وَالْبَصْرَةِ وَالشَّامِ وَاِنَّمَا الْحُجَّةُ فَهِيَ الْاَصْلُ الَّذِيْ يَجِبُ اَنْ يَرْجِعَ اِلَيْهِ وَعَمَل مِصْر اَوْبَلَد اَصْلاً وَلَا مِعْيَارًا فِي التَّشْرِيْحِ اَنَّ

---

❶ اعلام الموقعین' ۲/۳۷۵ فصل العمل الذی طریقه الاجتهاد

❷ اعلام الموقعین' ۲/۳۷۶-۳۷۷، فصل العمل الذی طریقه ❸ الاحکام فی اصول الاحکام' الجزء الثانی: ۱/۲۴۶ فصل فی ابطال ترجیح الحدیث بعمل اهل المدینة۔

مُلَخَّصًا فِقْهِ الْاِسْلَام. ص ۱۷۲

''جمہور ائمہ کا خیال ہے کہ مدینہ کو عمل میں باقی شہروں پر کوئی مرتبہ حاصل نہیں۔ اختلاف کے وقت سنت کا اتباع اصل چیز ہے، کسی عالم کا قول دوسرے پر حجت نہیں۔ صحابہ مختلف ممالک میں پھیل گئے۔ سب کے پاس علم تھا اصل چیز سُنت ہے کسی شہر کا عمل تشریع کی بنیاد قرار نہیں پا سکتا۔''

جمہور ائمہ اسلام کی عملِ اہل مدینہ کے متعلق یہی رائے ہے۔

خبرِ آحاد ❶

خبر آحاد کے متعلق بہت سے فنی مباحث ہیں جن کی تفصیل اصولِ فقہ اور اصولِ حدیث کی مبسوطات میں پائی جاتی ہے۔ آحاد میں راویوں کی کوئی تعداد معین نہیں، متواتر کے

---

❶ خبر کی دو قسمیں ہیں (۱) متواتر، اور (۲) آحاد، متواتر کی حجیت پر سب عقلمند متفق ہیں البتہ سمنیہ اور براہمہ متواتر کو بھی حجت نہیں سمجھتے۔ ان کا خیال ہے کہ کسی خبر سے بھی یقینی علم حاصل نہیں ہو سکتا، جب افراد اور آحاد سے یقین حاصل نہیں ہوتا تو متواتر انہی کے مجموعہ کا نام ہے، اس میں یقین کہاں سے آ گیا۔

متواتر کے سوا باقی سب آحاد ہیں، خبر دینے والا ایک ہو یا دس بیس، اصطلاح میں یہ خبر واحد ہی ہوگی۔ متواتر کا وجود چونکہ نسبتاً کم ہے، دنیا اور دین کے تمام کاروبار کا انحصار خبر واحد پر ہے، دینی مسائل بھی اکثر خبر واحد ہی سے ہم تک پہنچتے ہیں اور دُنیا کی بیشتر اطلاعات میں بھی خبر واحد ہی کار فرما ہے۔ حکومت سے لے کر عوام الناس تک اگر خبر واحد پر اعتماد کرنا ترک کر دیں تو کاروبار کا پورا کارخانہ برباد اور تباہ ہو کر رہ جائے، دوسری طرف تواتر کے عدد کا کسی کام کے لیے اجتماع ناممکنات سے ہے۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام وفود بھیجتے، ان وفود کی اطلاعات پر لڑائیاں لڑی جاتیں، ہزاروں جانیں ضائع ہو جاتیں مگر خبر واحد کی افادی حیثیت کبھی زیر بحث نہیں آئی۔

قرآن مجید نے فرمایا: ﴿اِذَا جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ۝﴾ [۴۹/حجرات:۶] جب کوئی فاسق فاجر آدمی بھی تمھیں اطلاع دے تو اس خبر کی تحقیق کر لو، ایسا نہ ہو کہ بعد میں ندامت اٹھانی پڑے۔''

فاسق کی خبر کو مسترد کرنے کا حکم نہیں دیا گیا البتہ تحقیق و تثبت کی تائید فرمائی گئی ہے۔ آیت میں وصف فسق کی تخصیص سے ظاہر ہے کہ ثقہ اور متدین آدمی کی اطلاع کے لیے یہ بھی چنداں ضروری نہیں، اس سے ظاہر ہے کہ خبر واحد کو دنیا کے معاملات میں کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ منافقین کے ارجاف سے بچنے کے لیے یہ تجویز نہیں کہ ان کی باتوں پر اعتبار کرنا چھوڑ دو بلکہ یہ فرمایا ایسی خبریں اہل علم اور اہل استنباط کی طرف لوٹائی جائیں تاکہ وہ ان سے صحیح نتائج اخذ کر سکیں۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ❀❀)

علاوہ سب اَحاد ہیں۔ اگر خبر واحد میں یقین کے قرائن موجود نہ ہوں یا ضعف کے قرائن پائے جائیں، ایسی خبر سے قطعاً علم حاصل نہیں ہوگا۔ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: وَلَا رَيْبَ اَنَّ

(گزشتہ سے پیوستہ) تبلیغ وموعظت کی ضرورت کے پیش نظر فرمایا: ﴿فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ﴾ [۹/التوبۃ ۱۲۲] یعنی ہر گروہ سے کچھ لوگ علم وتفقہ کے لیے سفر کریں اور واپس آ کر اپنی قوم کو ڈرائیں۔ طائفہ کا لفظ ایک اور اس سے زائد کے لیے مستعمل ہوتا ہے اور یہ خبر واحد ہی ہوگی، ان کے علم وانداز پر کوئی عددی پابندی نہیں لگائی گئی کہ جب تک وہ سو پچاس نہ ہو جائیں کوئی بات زبان سے نہ کہیں معلوم ہے جب وہ کہیں گے تو قرآن عزیز کی ہدایت کے مطابق ان کے ارشادات پر لازماً اعتماد ہوگا، خبر واحد کی حجیت اور اعتماد کے متعلق قرآن عزیز کی یہ صراحت ہے۔ آنحضرت ﷺ پر بھی پابندی نہیں لگائی کہ جب تک مخاطبین کی تعداد حد تواتر تک پہنچ جائے آپ کوئی لفظ زبان سے نہ فرمائیں، اگر خبر واحد شرعاً مستند نہ ہوتی تو آنحضرت ﷺ کے ارشادات پر ضرور کوئی نہ کوئی پابندی لگائی جاتی۔ ظاہر ہے کہ خبر واحد شرعی حجت ہے۔

اسی لیے ائمہ سنت نے تثبت اور تحقیق کے بعد اسے حجت مانا ہے، قرائن کے بعد اُسے پوری اہمیت دی ہے اور جو اس سے ثابت ہوا سے علم کی حیثیت سے قبول فرمایا ہے۔ سلسلہ احادیث میں اکثر اخبار آحاد ہیں، ائمہ حدیث نے جہاں ضرورت محسوس کی، تحقیق اور تعین فرمایا۔ قرائن کی چھان پھٹک فرمائی ہے، اس کے لیے اصول وضع فرمائے اور اسے قبول فرمایا۔ یہی ممکن تھا، امکان کی حدود سے آگے انسان کے اختیار کی چیز نہیں۔ اس کا عمل اور علم سعی اور کوشش، ممکنات تک محدود ہے، اس سے زیادہ کی تکلیف نہ اسے قدرت نے دی ہے نہ وہ اس کا مکلف ہے۔

خبر واحد اور اس پر بحث ونظر

پہلی صدی ہجری اسلامی روایات کا مقدس دور ہے، شریعت کی علمی اور عملی روایات اس وقت اپنے جوبن پر تھیں۔ جو کچھ اس وقت ہوا وہ اسلامی نقطۂ نظر سے بہت حد تک احترام وقبول کا مستحق ہے۔ ابن حزم فرماتے ہیں کہ پہلی صدی ہجری میں خبر واحد بلا انکار قبول کی جاتی تھی۔ اہل سنت، خوارج، شیعہ، قدریہ سب اسے قبول کرتے تھے۔ پہلی صدی کے بعد متکلمین معتزلہ نے کی اس میں اجماع اُمت کی مخالفت کی (الاحکام فی اصول الاحکام ۱/۱۰ الفصل فیہ اقسام الاخبار عن اللہ تعالیٰ الجزء الاول) شیخ محمد ابراہیم الوزیر الیمنی فرماتے ہیں:

''وَقَدْ اِنْعَقَدَ اِجْمَاعُ الْمُسْلِمِيْنَ عَلٰى وُجُوْبِ قَبُوْلِ الثِّقَاتِ فِيْمَا لَا يَدْخُلُهُ النَّظْرُ وَلَيْسَ ذَالِكَ بِتَقْلِيْدٍ بَلْ عَمَلٌ بِمُقْتَضَى الْاَدِلَّةِ الْقَاطِعَةِ الْمُوْجِبَةِ لِقَبُوْلِ خَبَرِ الْاَحَادِ وَهِيَ مُحَرَّرَةٌ فِيْ مَوْضِعِهَا مِنْ فَنِّ الْاُصُوْلِ وَلَمْ يُخَالِفْ فِيْ هٰذَا اِلَّا شِرْذِمَةٌ يَسِيْرَةٌ وَهُمْ مُتَكَلِّمُوْا بَغْدَادَ مِنَ الْمُعْتَزِلَةِ وَالْاِجْمَاعُ مُنْطَبِقٌ قَبْلَهُمْ وَبَعْدَ هُمْ عَلٰى بُطْلَانِ قَوْلِهِمْ الروض الباسم في الذب عن سنة ابي القاسم بيان ان الاشكال الذى اورده المعترض لا يختص باهل السنة ورواة الحديث: ۱/۳۲۔

ثقات کی ایسی خبریں جن پر کوئی اعتراض نہ ہو۔ ان کے قبول پر اہل اسلام کا اجماع ہے اور یہ تقلید نہیں بلکہ قطعی دلائل کا تقاضا ہے۔ جن کا مفاد یہ ہے کہ اخبار آحاد کا قبول اور ان سے احتجاج ضروری ہے یہ مسئلہ فن اصول میں اپنی جگہ پر مرقوم ہے اور بغداد کے معتزلہ متکلمین کے سوا کسی نے اس کی مخالفت نہیں کی بلکہ اس پر اجماع پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے۔ اخبار آحاد پر اعتراض عموماً ان لوگوں نے کیا جو انسانی نفسیات (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(گزشتہ سے پیوستہ) سے ناواقف اوران کی حوحدودامکان سے ناآشنا تھے۔آج بھی اس میں وہی نیچر پرست شبہات کی راہیں پیدا کررہے ہیں جوزمین پر بیٹھ کرآسمان کی باتیں کرنے کے عادی ہیں۔چنانچہ مختلف ادوار میں اخبار آحاد کے خلاف اُنہی حلقوں سے آوازاُٹھی جویاد تو خود بدعت کے داعی تھے یااہل بدعت سے ایک گونہ متاثر تھے۔

منکرین	کونسی حدیث کے؟	کب؟
ا۔خوارج	جواہل بیت کے فضائل میں تھیں۔	۲۰۰ھ
۲۔شیعہ	جواحادیث صحابہ رضی اللہ عنہم کے فضائل میں تھیں۔	۲۰۰ھ
۳۔معتزلہ اورجہمیہ	احادیث صفات الٰہی	
۴۔ قاضی عیسیٰ بن ابان اور ان کے اتباع	جو احادیث غیر فقیہ صحابہ سے مروی ہیں۔	۲۲۱ھ
۵۔متاخرین فقہاسے قاضی ابوزید دبوسی وغیرہ	ایضاً	ایضاً
۶۔اس کے بعد معتزلہ اور متکلمین کے ساتھ متاخرین فقہا کی ایک مختصرسی جماعت	اصول اور فروع دونوں میں ان حضرت نے خبرِ واحد سے اختلاف کیا۔	۴۰۰ھ کے بعد
۷۔یورپین تہذیب سے مرعوب گروہ،مولوی چراغ علی،سرسیداحمد خاں وغیرہ	یہ حضرات فن سے قطعاً ناواقف تھے ان کی تحقیق میں احادیث تاریخ کا ذخیرہ ہیں جوان کی نیچر کے موافق ہوا قبول کر لیااور جومخالف ہواترک کردیا	۱۳۰۰ھ کے قریب قریب
۸۔ مولوی عبداللہ چکڑالوی،مستری محمدرمضان گوجرانوالہ،مولوی حشمت علی لاہوری،مولوی رفیع الدین ملتانی،	احادیث کابالکلیہ انکار	۱۳۰۰ھ کے بعد
۹۔مولوی احمددین صاحب امرتسری، مسٹر غلام احمد پرویز۔ یہ حضرات سرسید سے متاثر ہیں لیکن جاہل اور غیر محتاط۔	ان کے نزدیک قرآن وحدیث اور پورادین ایک کھیل ہے یازیادہ سے زیادہ ایک سیاسی نظریہ جسے ہروقت ہمیں بدلنے کاحق حاصل ہے۔مولوی احمد دین بعض متواتر اعمال کومستثنیٰ سمجھتے تھے۔	۱۴۰۰ھ
۱۰۔ مولانا شبلی مرحوم، مولانا حمید الدین فراہی،مولاناابوالاعلیٰ مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی اور عام فرزندانِ ندوہ، باستثنائے حضرت سیدسلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ	یہ حضرات حدیث کے منکرنہیں لیکن ان کے اندازِ فکر سے حدیث کا استخفاف اور استحقار معلوم ہوتا ہےاورطریقۂ گفتگو سے انکار کے لیے چوردروازے کھل سکتے ہیں	(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مُـجَرَّدَ خَبَرِ الْوَاحِدِ الَّذِیْ لَادَلِیْلَ عَلٰی صِدْقِهٖ لَایُفِیْدُ الْعِلْمَ: ❶ خبرواحد میں اگر صدق کے قرائن موجود نہ ہوں تو اس سے علم حاصل نہیں ہوگا۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے کتب حدیث کے پانچ طبقات متعین فرمائے ہیں آخر میں فرمایا: اَمَّـا الطَّبْقَةُ الْاُوْلٰی وَالثَّانِیَةُ فَعَلَیْهِمَا اِعْتِمَادُ الْمُحَدِّثِیْنَ وَحَوْمَ حِمَاهُمَا مَرْتَعُهُمْ وَمَسْرَعُهُمْ ❷ ائمہ حدیث کا اعتماد پہلے اور دوسرے طبقہ پر ہے۔ یہی ان کے اعتماد کا محوری نقطہ ہے۔ تیسرا طبقہ جس میں بیہقی، طحاوی، مصنف ابن ابی شیبہ اور طبرانی وغیرہ کو شمار کیا ہے، اس سے صرف ماہرین فن استفادہ کرسکتے ہیں، یہ عوام کے استعمال اور استفادہ کی چیز نہیں۔ باقی طبقات سے اہلِ بدعت استدلال کرتے ہیں، اہل حدیث ان پر اعتماد نہیں کرتے'' (حجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ۱۰۸) کیونکہ ان طبقات میں صدق کے قرائن ناپید ہیں، ان کی اسانید میں خبط ہے اور ان کے رجال کتابوں میں عموماً ناپید ہیں ❸

(❀❀ گزشتہ سے پیوستہ) آحاد کے خلاف اُنہی حلقوں سے آواز اٹھی جو یا تو خود بدعت کے داعی تھے یا اہل بدعت سے ایک گونہ متاثر تھے۔ یہ جدول میرے ذاتی مطالعہ کا نتیجہ ہے مجھے اس کے کسی حصہ پر اصرار نہیں۔ میں ممنون ہوں گا اگر مجھے میری لغزش سے آگاہ کیا جائے۔ میرے خیال میں تحریکِ انکارِ حدیث تدریجی ارتقا سے اس مقام تک پہنچی ہے۔

تحقیق وتثبت کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآن عزیز کا ہے اور فی الحقیقت اس کے انکار کا ایمان ودیانت پر بالکل وہی اثر ہے جو قرآن عزیز کے انکار کا۔ قرآن عزیز کے الفاظ کی تاویل میں جب اختلاف ہو تو اس کے الفاظ کی قطعیت میں شبہ نہیں ہوگا، لیکن مفہوم کی تاویل اور اس کے تعین میں بحث رہے گی، جو تاویل قواعد صحیحہ اور علومِ سنت کے خلاف ہوگی اس کے منکر کو قرآن کا منکر کہا جائے گا۔ اختلاف تاویل کسی کو اس فتویٰ سے بچا نہیں سکتا ٹھیک اسی طرح جو احادیث قواعدِ صحیحہ اور ائمہ سنت کی تصریحات کے مطابق صحیح ثابت ہوں ان کا انکار کفر ہوگا اور ملت سے خروج کے مترادف، صرف اختلاف اور وہ بھی ایسے حضرات کا جو حقیقت کو اپنے موقف اور مقام سے نہیں ہٹا سکتا۔ قرآن اختلاف تاویل کے باوجود خدا کا کلام ہے اور شرعاً حجت، اسی طرح حدیث تحقیق وتثبت کے باوجود خدا کی طرف سے وحی ہے اور دین میں قرآن کے بعد حجت، امام عثمان سعید دارمی (۲۸۲ھ) فرماتے ہیں لِاَنَّ هٰـذَا الْحَدِیْثَ اِنَّمَا هُوَ دِیْنٌ بَعْدَ الْقُرْاٰنِ.

❶ کتاب الرد علی المنطقیین' المقام الثانی' الوجه الثانی' خبر الواحد بلا دلیل لا یفید العلم' ص۳۸۔

❷ حجة الله البالغة' ۱/۱۳۵ باب طبقه کتب الحدیث

❸ رد الامام الدارمی عثمان بن سعید علی بشر المریسی العنید' الذب عن عبدالله بن عمرو بن العاص' ص۱۳۷۔

صدق کے قرائن

اگر آحاد کے متعلق صدق کے قرائن موجود ہوں، مثلاً [1] اس کی سند صحیح ہو [2] امت نے اسے قبول کیا ہو [3] مصنف نے صحت کا التزام کیا ہو [4] امت نے اس التزام کو درست تسلیم کیا ہو' اہل علم [5] نے ان کتب کی خدمت کی ہو، شرحیں لکھی ہوں، لغات کو حل کیا ہو، رجال کو منضبط کیا ہو، مقدمات وحواشی لکھے ہوں، غرض اعتماد کی نظر سے دیکھا ہو یا [6] واحد عن واحد منقول ہو اور اس میں شرائطِ صحت پائی جائیں یا اُمت نے عملاً اُسے قبول کرلیا ہو' رواۃ کی ثقاہت معلوم ہو، ان حالات میں اس سے بھی یقین حاصل ہوگا اور اس پر عمل بھی واجب ہوگا۔ علامہ آمدی نے خبر واحد کے متعلق بہت بسط سے لکھا ہے لیکن اہل ظاہر اور اہل حدیث کے مسلک کا ذکر بہت اجمال سے فرمایا ہے' ❶ الاحکام فی اصول الاحکام ابن حزم، صواعق مرسلہ علی الجہمیۃ والمعطلۃ میں دونوں مسلک تفصیل سے مرقوم ہیں، ❷ اسی سے اہل حدیث کا مسلک پوری طرح واضح ہوجاتا ہے۔ وَالْقِسْمُ الثَّانِیْ مِنَ الْاَخْبَارِ مَانَقَلَهُ الْوَاحِدُ مِنَ الْوَاحِدِ فَهٰذَا اِذَا اتَّصَلَ بِرِوَایَةِ الْعُدُوْلِ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَجَبَ الْعَمَلُ بِهٖ وَوَجَبَ الْعِلْمُ بِصِحَّتِهٖ اَیْضاً ❸ ''جب ایک راوی دوسرے سے اتصال کے ساتھ نقل کرے اور یہ عادل ہوں تو اس پر عمل بھی واجب ہے اور اس کی صحت پر یقین بھی ضروری ہوگا۔'' دوسرے مقام پر مرقوم ہے: فَصَحَّ بِهٰذَا اِجْمَاعُ الْاُمَّةِ کُلِّهَا عَلٰی قَبُوْلِ خَبَرِ الْوَاحِدِ الثِّقَةِ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ ❹ خبر واحد صحیح کے قبول پر پوری امت کا اجماع ہے پھر ج اص ۱۸۸ میں فرمایا: وَقَدْ ثَبَتَ عَنْ اَبِیْ حَنِیْفَةَ وَمَالِکٍ وَالشَّافِعِیِّ وَاَحْمَدَ وَدَاوٗدَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وُجُوْبُ الْقَوْلِ بِخَبَرِ الْوَاحِدِ وَهٰذَا حُجَّةٌ عَلٰی مَنْ قَلَّدَ اَحَدَهُمْ فِیْ وُجُوْبِ الْقَوْلِ بِخَبَرِ الْوَاحِدِ ❺ ائمہ اربعہ اور داؤد ظاہری سب خبر واحد کے قبول پر متفق ہیں اور یہ

---

❶ الاحکام للآمدی' ۲/ ۴۸' ۶۰ فی حقیقة خبر الواحد' البالب الثالث۔

❷ الصواعق المرسله واعاالقسم' الثانی من الاخبار ۲/ ۳۷۲۔۴۱۲ الاحکام لا بن حزم' فصل فیه اقسام الاخبار عن اللّٰه تعالیٰ القسم الثانی۔ ❸ الاحکام فی اصول الاحکام' فصل فی اقسام الخبر عن الله: ۱/ ۱۰۶ والاحکام لابن حزم:فصل فیه اقسام الاخبار عن اللّٰه تعالیٰ' القسم الثانی' ۱/ ۱۰۶'۔ ۱۱۵۔ ❹ الاحکام لِابن حزم ۲/ ۱۱۰ الجزء الاول فصل فی اقسام الخبر عن الله۔

❺ الاحکام ابن حزم' فصل فی اقسام الخبر عن اللّٰه ۱/ ۱۱۴ الاجزء الاول۔

ان کے اتباع پر حجت ہے۔ 1

متاخرین فقہا

ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ متقدمین ائمہ کے اجماع کا ذکر فرمانے کے بعد متاخرین فقہا کا ذکر فرماتے ہیں جو معتزلہ اور متکلمین سے متاثر ہو کر مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے تھے اور جنہوں نے ظن مصطلح کو حدودِ علم سے باہر سمجھا۔ امام نے دو اصول پر زور دیا ہے (۱) وہ فرماتے ہیں کہ دین کامل ہے جیسے آیت ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ الخ 2 سے ظاہر ہے، پھر اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لیا جو ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝﴾ 3 سے واضح ہے۔ اگر متاخرین فقہا کے خیال کے مطابق کامل دین پر ظنون واوہام غالب ہو جائیں اور حق وباطل اس طرح آمیز ہو جائیں کہ امتیاز ناممکن ہو تو حفاظت کا وعدہ کس طرح پورا ہوا؟ کیونکہ ذکر کا لفظ کتاب اللہ اور سنت دونوں پر حاوی ہے پس اگر متاخرین کا خیال مان لیا جائے تو هٰذَا اِنْسِلَاخٌ مِنَ الدِّيْنِ وَهَدَمٌ لِلدِّيْنِ وَتَشْكِيْكٌ فِي الشَّرَائِعِ 4 اس عقیدے کے بعد انسان دین سے بالکلیہ خارج ہو جائے گا اور دین کی پوری عمارت پیوند خاک ہو کر رہ جائے گی۔

(۲) معلوم ہے کہ خبر واحد میں تمام شبہات سند کی وجہ سے ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، اس وقت نہ تو سند تھی نہ کوئی شبہ گویا اللہ کی حفاظت یہیں ختم ہو گئی۔ مستقبل کے لیے اللہ تعالیٰ کوئی انتظام نہ فرما سکے بلکہ وضاع اور دجاجلہ دین پر غالب آ گئے۔ جب ایسا نہیں تو لازماً دین قیامت تک محفوظ ہو گا اور یہ آحاد کی حفاظت سے ہی ہو گا۔ فَقَدْ ثَبَتَ يَقِيْنًا اَنَّ خَبَرَ الْوَاحِدِ الْعَدْلِ عَنْ مِثْلِهٖ مُبْلِغًا عَنْ مِثْلِهٖ مُبْلِغًا اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم حَقٌّ مَقْطُوْعٌ بِهٖ مُوْجِبٌ لِلْعَمَلِ وَالْعِلْمِ مَعًا. 5 لہٰذا ثابت ہوا کہ حدیث صحیح

---

1 ائمہ اصول نے خبر واحد کو ظنی لکھا ہے اس ظن کا محدثین کی اصطلاح میں یہ مطلب ہے کہ اس علم کا مرتبہ اس علم سے کم ہے جو متواتر سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ ظن بمعنی وہم نہیں جیسے منکرین حدیث نے سمجھا۔ (من المؤلفؒ)

2 ۵/المآئدہ:۳۔ 3 ۱۵/الحجر:۹۔

4 الاحکام' ۱/۱۹۹ لابن حزم الجزء الاول فصل هل يوجب خبر الواحد العلم مع العمل او العمل دون العلم۔ 5 الاحکام' ۱/۱۶۰ لابن حزم الجزء الاول فصل هل يوجب خبر الواحد العلم والعمل معاً او العمل دون العلم۔

متصل پر عمل واجب ہے اور اس کی صحت بھی یقینی ہے۔

اہل حدیث کا مسلک

اہل حدیث کے نزدیک خبر واحد میں جب صدق کے قرائن پائے جائیں یعنی حدیث کی ثقاہت اور اتصال وغیرہ قرائن موجود ہوں تو وہ مفید علم ہوگی۔ وَعِنْدَ بَعْضِ اَهْلِ الْحَدِيْثِ يُوْجِبُ الْعِلْمَ لِاَنَّهٗ يُوْجِبُ الْعَمَلَ وَلَا عَمَلَ اِلَّا عَنْ عِلْمٍ [1] عمل علم کی فرع ہے، جب علم ہی نہ ہو تو عمل کیسے ہوگا۔ اس لیے اہلحدیث کا مذہب ہے کہ خبر واحد سے علم اور یقین حاصل ہوگا۔ آمدی فرماتے ہیں: وَالْمُخْتَارُ حُصُوْلُ الْعِلْمِ بِخَبَرِهٖ اِذَا احْتُفَّتْ بِهِ الْقَرَائِنُ وَيَمْتَنِعُ ذَالِكَ عَادَةً دُوْنَ الْقَرَائِنِ [2] مختار مذہب یہی ہے کہ اگر قرائن موجود ہوں تو علم حاصل ہوگا ورنہ عادۃ منع ہے۔

اصول بزدوی ص۶۹۱ ج۲ (قَالَ بَعْضُ اَهْلِ الْحَدِيْثِ يُوْجِبُ عِلْمَ الْيَقِيْنِ لِمَاذَكَرْنَا اَنَّهٗ اَوْجَبَ الْعَمَلَ وَلَا عَمَلَ مِنْ غَيْرِ عِلْمٍ وَقَدْ وَرَدَ الْاٰحَادُ فِيْ اَحْكَامِ الْاٰخِرَةِ مِثْلِ عَذَابِ الْقَبْرِ وَرُؤْيَةِ اللّٰهِ تَعَالٰى بِالْاَبْصَارِ وَلَا حَظَّ لِذَالِكَ اِلَّا الْعِلْمُ) [3] بعض اہل حدیث نے کہا کہ خبرِ واحد سے یقینی علم حاصل ہوتا ہے، کیونکہ جب عمل واجب ہے تو عمل علم کے بغیر کیسے ہو سکتا ہے اور آحاد میں عذابِ آخرت اور عذاب قبر اور رؤیتِ باری تعالیٰ کے متعلق جو کچھ وارد ہوا ہے اس کا مقصد علم اور اعتقاد ہی تو ہے۔

بعض اہل علم کا خیال ہے کہ اعمال میں تو خبر واحد سے استدلال درست ہے مگر اصول اور عقائد میں استدلال درست نہیں۔ بزدوی کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہلحدیث کے نزدیک یہ تفریق درست نہیں، اہل حدیث اعمال اور عقائد دونوں میں خبر واحد کو حجت سمجھتے ہیں ذَهَبَ اَكْثَرُ اَهْلِ الْحَدِيْثِ اِلٰى اَنَّ الْاِخْبَارَ الَّتِيْ حَكَمَ اَهْلُ الصَّنْعَةِ بِصِحَّتِهَا تُوْجِبُ عِلْمَ الْيَقِيْنِ بِطَرِيْقِ الضَّرُوْرَةِ وَهُوَ مَذْهَبُ اَحْمَدَ بْنِ حَنْبَلَ۔ [4] اہل حدیث

---

[1] التوضیح والتلویح مع الحاشیة التوشیح' ٤٦٦ الرکن الثانی فی السنة۔

[2] الاحکام للآمدی' ٢/ ٥٠ الباب الثالث المساله الاولیٰ۔

[3] کشف الاسرار عن اصول فخرالاسلام البذدوی'٦/ ٣٧١ باب خبرالواحد۔

[4] کشف الاسرار' ٢/ ٣٧١ باب خبر الواحد الفصل الثالث۔

اور امام احمد کا مذہب ہے کہ صحیح احادیث سے یقینی علم حاصل ہوتا ہے۔ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: جو لوگ خبرِ واحد سے علم کی نفی کرتے ہیں وہ معتزلہ اور بدعی فرقوں سے متاثر ہیں بعض فقہا اور ائمہ اصول بھی ان سے متاثر ہیں لیکن سلفِ امت میں انکا کوئی پیشرو نہیں، ائمہ سنت امام شافعی، امام مالک، امام احمد، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہم اور ان کے تلامذہ امام داؤد، ابن حزم، حسین بن علی، کرابیسی وغیرہ نے فرمایا کہ خبر واحد سے یقینی علم حاصل ہوتا ہے [1]۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے پاس کسی آدمی کا ذکر ہوا جو کہتا تھا کہ خبر واحد سے عمل واجب ہوتا ہے لیکن علم حاصل نہیں ہوتا۔ امام نے اسے ناپسند کیا اور فرمایا: ''میں نہیں جانتا یہ کیا بلا ہے۔'' [2] اس سے ظاہر ہے ائمہ اربعہ اور قدما اس مسئلہ میں اہلحدیث کے ساتھ ہیں۔ خبر واحد پر بدگمانی اس وقت پیدا ہوئی جب متکلمین اور فلاسفہ نے اسلامی عقائد پر یورش کی اور متاخرین فقہا اس سے متاثر ہو گئے۔

وجدان اور شعور

علم اور یقین کا مسئلہ بہت حد تک وجدانی ہے۔ اس معاملہ میں صرف تعداد ہی نہیں، رجال کے اوصاف بھی موثر ہوتے ہیں، زہد و تقویٰ کی کمی کے باوجود جب ہم بااخلاق اور متدین آدمی سے کوئی خبر سن لیں تو ہم اپنے دل میں بہت زیادہ اطمینان محسوس کرتے ہیں، عامی یا غیر متدین آدمی متعدد بھی ہوں تو دل میں وہ یقین پیدا نہیں ہوتا مگر رواۃ کے اوصاف اور دُوسرے قرائن سے علم و یقین میں اضافہ ہوتا ہے۔ تعجب ہے کہ جماعتِ اسلامی کی قیادت نے عام فرقوں کی طرح خبرِ واحد کی ظنیت کا وظیفہ شروع فرما دیا، حالانکہ دینی جماعتوں کا طریق فکر، بدعی فرقوں سے مختلف ہونا چاہئے۔ تعجب ہے جس جماعت کی دعوت اقامتِ دین ہو وہ رواۃِ حدیث کا عام خبروں کے رواۃ سے موازنہ کرے۔ اعتزال و تجہم کے مغالطہ سے متاثر ہو جائے اور پھر اس کا اظہار ایسے وقت میں کرے جب ملک میں اہل بدعت احادیث اور سنن کے خلاف ایک شور برپا کر رہے ہوں۔ حالانکہ اہل دیانت کی وجدانی کیفیت کو اہل دیانت ہی سمجھتے ہیں، اہل بدعت کے لیے اس کا سمجھنا مشکل ہے۔ ائمہ حدیث اس وجدان اور شعور کو اچھی طرح جانتے تھے، اُنہوں نے اوصاف رواۃ اور موافق قرائن اور مخالف اثرات کو ذہن

[1] الصواعق المرسلہ' ۲/ ۳٦۲ فصل خبر الواحد بحسب الدلیل۔

[2] الصواعق المرسلہ' ۳/ ۳٦۳ فصل خبر الواحد بحسب الدلیل۔

میں رکھ کر فرمایا: وَالْآحَادُ فِی ھٰذَا الْبَابِ قَدْ تَکُوْنُ ظُنُوْنًا بِشُرُوْطِھَا فَإِذَا قَوِیَتْ صَارَتْ عُلُوْمًا فَإِذَا ضَعُفَتْ صَارَتْ أَوْھَامًا وَخِیَالَاتٍ فَاسِدَۃً. ❶ اخبارآحاد کبھی ظنی ہوتی ہیں کبھی علم ویقین کے مترادف اور کبھی اوہام اور فاسد خیالات۔

تلقی بالقبول

امت کے قبول اور عمل سے بھی حدیث یقین کے مقام پر پہنچ جاتی ہے۔

حدیث: إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ، ❷ حدیث ذوقِ عسیلہ، ❸ صدقۂ فطر، ❹ حرمتِ نکاح مع العمۃ والخالہ، ❺ حدیث حرمت رضاع مثل نسب، ❻ تعیین عشرہ مبشرہ ❼ وغیرہ احادیث کو امت نے عملاً قبول کر لیا ہے، ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ان سے متواتر ہی کی طرح یقین حاصل ہوتا ہے۔ أَمَّا السَّلَفُ فَلَمْ یَکُنْ بَیْنَھُمْ فِی ذٰلِکَ نِزَاعٌ ❽

❶ **الصواعق المرسلہ**' ۲/۳۷۴ اما القسم الثانی من الاخبار۔

❷ **بخاری**' کتاب بدء الوحی' باب کیف کان بدء الوحی الیٰ رسول اللّٰہ؛ **مسلم**' کتاب الجہاد: باب قولہ علیہ السلام: ((**انما الاعمال بالنیات**)) رقم: ۴۹۲۷؛ **ابو داؤد**' کتاب الطلاق: باب فی ما عنی بہ الطلاق والنیات: ۲۲۰۱؛ **النسائی**' کتاب الایمان: باب النیۃ فی الیمین رقم ۳۸۲۵؛ **ابن ماجہ**' کتاب الزھد: باب النیۃ' رقم ۴۲۲۷۔

❸ **بخاری**' کتاب الشہادات باب شہادۃ المختبیٔ ۲۶۳۹؛ **ابو داؤد**' کتاب الطلاق باب المبتوتۃ لایرجع الیھا زوجھا' ۲۳۰۹؛ **الترمذی**' کتاب النکاح باب ماجاء فیمن یطلق امرأتہ ثلاثا ۱۱۱۸۔

❹ **بخاری**' کتاب الزکاۃ باب فرض صدقۃ الفطر: ۱۵۰۳؛ **مسلم**' کتاب الزکاۃ باب زکاۃ الفطر: ۱۶۰۹؛ **النسائی**' کتاب الزکاۃ باب فرض زکاۃ رمضان: ۲۵۰۲۔

❺ **بخاری**' کتاب النکاح باب لاتنکح المرأۃ علی عمتھا: ۵۱۰۸؛ **مسلم**' کتاب النکاح باب تحریم الجمع بین المرأۃ وعمتھا: رقم ۳۴۴۴؛ ابو داؤد کتاب النکاح باب ما یکرہ ان یجمع بینھن من النساء: ۲۰۶۵؛ **ترمذی**' کتاب النکاح باب ماجاء لا تنکح المرأۃ علی عمتھا: ۱۱۲۵؛ **النسائی**' کتاب النکاح باب تحریم الجمع بین المرأۃ وخالتھا: ۳۲۹۷۔

❻ **بخاری**' کتاب الشہادات باب الشہادۃ علی الانساب: ۲۶۴۵؛ **مسلم**' کتاب الرضاع' باب یحرم من الرضاعۃ ۳۵۶۸ **ابو داؤد**' کتاب النکاح باب یحرم من الرضاعۃ ما یحرم من النسب: ۲۰۵۵۔

❼ **ترمذی**، کتاب المناقب باب مناقب عبدالرحمن بن عوف: رقم ۳۷۴۸؛ **ابو داؤد**' کتاب السنۃ باب فی الخلفاء: ۴۶۴۹؛ **سلسلہ احادیث الصحیحۃ**: رقم ۱۴۳۰؛ **فیض القدیر**' رقم ۵۴۳۴۔

❽ **الصواعق المرسلہ**' ۲/۳۷۳۔

سلف میں اس کے متعلق کوئی نزاع نہ تھی۔

بخاری اور مسلم کی احادیث کی صحت پر امت متفق ہے اور انہیں تلقی بالقبول کا مقام حاصل ہوا ہے۔ ابن الصلاح فرماتے ہیں: لِاِتِّفَاقِ الْاُمَّةِ عَلٰی تَلَقِّیْ مَا اتَّفَقَا عَلَیْهِ بِالْقُبُوْلِ وَهٰذَا الْقِسْمُ جَمِیْعُهٗ مَقْطُوْعٌ بِصِحَّتِهٖ وَالْعِلْمُ الْیَقِیْنِیُّ النَّظَرِیُّ وَاقِعٌ بِهٖ. [1] ''امت نے صحیحین کی متفقہ روایات کو اجماعاً قبول فرمایا ان احادیث کی صحت قطعی ہے، اس سے علم نظری اور یقینی حاصل ہوتا ہے ہم مولانا اصلاحی کو قطعاً تکلیف نہیں دیتے کہ وہ ائمہ حدیث کو معصوم سمجھیں لیکن امت کی عصمت پر تو غور فرمانا چاہیے۔ اُمت کی تلقی ائمہ حدیث اور اہل حدیث کے نزدیک بے حد مضبوط قرینہ ہے، تلقی بالقبول اور احادیث صحیحین کے افادہ یقین کے متعلق دراسات اہلبیت میں نہایت نفیس اور مبسوط بحث موجود ہے جسے طوالت کی وجہ سے نظر انداز کیا جا رہا ہے اہل تحقیق کے لیے وہ بحث بہت مفید ہوگی۔

متاخرین میں مولانا سید انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ دقتِ نظر اور وسعتِ معلومات میں یگانۂ روزگار تھے، بخاری کے حاشیہ میں فرماتے ہیں: حَاصِلُهٗ اَنَّهٗ یُفِیْدُ الْقَطْعَ اِذَا احْتَفَّ بِالْقَرَائِنِ کَخَبَرِ الصَّحِیْحَیْنِ عَلَی الصَّحِیْحِ بَیْدَ اَنَّهٗ یَکُوْنُ نَظَرِیًّا وَنُسِبَ اِلٰی اَحْمَدَ اَنَّ اَخْبَارَ الْاٰحَادِ تُفِیْدُ الْقَطْعَ مُطْلَقًا [2] ''حاصل یہ ہے کہ خبر واحد میں اگر قرائن موجود ہوں تو اس سے علم یقینی و نظری حاصل ہوگا۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ اس سے قطعیت کا فائدہ حاصل ہوگا۔'' دراصل یہ اختلاف قرائن کے قوت اور ضعف پر موقوف ہے۔

اس اختلاف کا پس منظر

انسان ماحول کا غلام ہے، معتزلہ اور ائمہ کلام اور دوسرے بدعتی گروہوں کا تعلق عموماً شاہی درباروں سے رہا عباسی دربار تو ان مناظرہ بازیوں میں مشہور تھے۔ وہاں یہ سب کچھ فتح و شکست اور دفتری اقتدار کے لیے ہوتا تھا۔ ان حالات میں سخن سازی، غلط گوئی ہر چیز جائز سمجھی جاتی تھی تا کہ دربار میں اعزاز حاصل ہو۔ ایسے وقت میں پارٹی بازی لازمی ہے اور

[1] مقدمہ ابن صلاح، ص ۲۹؛ الصواعق المرسلہ ۲/ ۳۷۵ القسم الثانی من الاخبار۔

[2] فیض الباری، کتاب الاعتصام: ۴/ ۵۰۶۔

جھوٹ سے پرہیز ناممکن۔ فرد تو فرد ہے، جماعتیں غلط بیانی کرتی ہیں، اس ماحول میں خبر واحد پر اعتماد کون کرے اور کیوں کرے۔ اس معاملہ میں معتزلہ اور متکلمین معذور ہیں۔

ائمہ حدیث کی بے نیازی

ائمہ حدیث کا ماحول اس سے بالکل مختلف تھا، درباروں سے بے نیاز، بادشاہوں سے نفرت، ہر چیز اللہ کی رضا اور خدمت دین کے لیے۔ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: **كُلُّ اَحَدٍ يَعْلَمُ اَنَّ اَهْلَ الْحَدِيْثِ اَصْدَقُ اَهْلِ الطَّوَايِفِ كَمَا قَالَ اِبْنُ الْمُبَارَكِ وَجَدْتُ الدِّيْنَ لِاَهْلِ الْحَدِيْثِ وَالْكَلَامَ لِلْمُعْتَزِلَةِ وَالْكَذِبَ لِلرَّافِضَةِ وَالْحِيَلَ لِاَهْلِ الرَّاْيِ** [1] "سب جانتے ہیں کہ اہل حدیث بہت سچے ہیں۔ ابن مبارک نے فرمایا: دین اہل حدیث کے پاس ہے، باتیں بنانا معتزلہ کے پاس، جھوٹ روافض کی عادت اور اہل الرائے حیلوں کے عادی ہیں۔" اس ماحول میں جہاں کوئی لالچ نہ ہو جھوٹ کیوں بولا جائے اور کون بولے؟ جو لوگ ان دونوں گروہوں کو برابر سمجھیں انہیں اس اختلاف میں تطبیق دینا مشکل ہوگا اور جو لوگ اس پس منظر کو سمجھتے ہیں، انہیں اس کے سمجھنے اور تطبیق دینے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔ انسان جیسے ماحول میں رہے اس کی نفسیات اس سانچے میں ڈھل جاتی ہیں، **وَلَنِعْمَ مَاقِيْلَ عَنِ الْمَرْءِ لَا تَسْئَلْ وَسَلْ عَنْ قَرِيْنِهٖ**۔

احادیث سے استفادہ

اس عنوان کے تحت ترجمان القرآن [2] (ص ۱۴۰ سے ص ۱۴۵ تک) مولانا اصلاحی ایسے متین اور صاحب فکر کا قلم طنزیہ تعریضات کی طرف پھر گیا ہے۔ اگر مولانا یہ انداز اختیار نہ فرماتے تو ہم بھی مولانا کے ارشادات پر اور زیادہ غور کرتے' اپنے نقائص اور نارسائیوں کے متعلق ضرور سوچتے۔ اخبارات کے لب ولہجہ سے جو خلش مولانا کے ذہن میں تھی اس کا انتقام جماعت اور مسلک سے لینے کی کوشش فرمائی گئی۔ **عَفَا اللّٰهُ عَنَّا وَعَنْهُ**.

---

[1] الصواعق المرسله' ۲/ ۵۹ فصل واما المقام الرابع افادتها للعلم واليقين۔ [2] ترجمان القرآن' جلد : ٤٥ شمارہ نمبر ۲ : احادیث سے استفادہ کرنے کے لیے پہلی شرط: ص ۱٤۰' ۱۹۵۵ء

ماخذ میں غلو اور تحزّب

جہاں ہمیں اپنے حالات کا علم ہے اپنی کمزوریوں کے اعتراف کے باوجود ذہن بحمد اللہ بالکل صاف ہے، نہ کسی ماخذ کے لیے غلو ہے نہ تعصب، البتہ اپنے اسلاف کے کارناموں کا احترام ضرور ذہن میں ہے اسے تعصب سے تعبیر فرمایئے یا غلو سے، آپ اور آپ کے رفقا مختار ہیں، یہاں نہ "تحزّب" ہے نہ "تشیّع" نہ یک چشمی"۔ مآخذ کو ان کی ترتیب ہی کے لحاظ سے مانتے ہیں، البتہ مقاصد کو ضرور پیش نظر رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے ہمارے ہاں تفقہ، درایت اور قیاس کا اپنی جگہ پر پورا پورا احترام ہے لیکن سنن صحیحہ کو گو وہ آحاد ہی کیوں نہ ہوں، ہم ان حیلوں اور الفاظ کی ہیرا پھیری سے رد کرنا پسند نہیں کرتے، اعمال رجال خواہ وہ مدینہ میں ہوں یا خراسان میں، کوفہ میں ہوں یا شام میں، سنتِ صحیحہ کے ہم پایہ نہیں ہو سکتے۔ ہمارے ہاں اس وہم کی کوئی قیمت نہیں کہ فلاں شخص چونکہ مدینہ میں مقیم ہے اس لیے اس کے اعمال سنت ہیں۔ بلکہ ان سے سنتِ صحیح کو رد بھی کیا جا سکتا ہے۔ ہم بحمد اللہ مراتب کا احترام کرتے ہیں اور جناب کی نصیحت سے بہت پہلے یہ احترام موجود ہے۔ شاہ صاحب اور خطابی نے جمع حدیث کے متعلق جو شکوہ فرمایا ہے۔ وہ اپنی جگہ پر درست ہے، سیوطی ہیثمی، ابنِ ابی الدنیا' طبرانی، دیلمی وغیرہ نے جس طرح احادیث جمع فرمائی ہیں اس سے واقعی اہلحدیث کے مسلک اور سلف کی روش کو نقصان پہنچا ہے، اہل بدعت بلاتحقیق ان ذخائر سے استدلال کرتے ہیں، لیکن اس میں بھی فن کے لیے کوئی عصبیت نہیں، سیوطی ہیثمی وغیرہ پر عصبیت کی بدگمانی نہیں کی جا سکتی۔ طریقۂ تصنیف کی ایک لغزش ہے، یہ حضرات خود بھی اس کے قائل نہیں کہ ان تصانیف میں جو کچھ جمع کیا گیا ہو سب مستند اور قابل عمل ہے۔ مولانا اطمینان رکھیں کہ ہمارے ہاں یہ عیب نہیں۔

جناب کے ہاں دو تین ایسے بزرگ موجود ہیں جنہوں نے اہل حدیث کے ہاں تعلیم پائی ہے، ان سے دریافت فرمایئے کہ جماعت اسلامی میں شمولیت سے پہلے کبھی انہوں نے اندھا دھند احادیث کو بلاتحقیق قبول فرمایا؟ یا موضوع اور مقلوب روایات کو قابلِ عمل سمجھا؟ اب اگر جماعتی عصبیت ان کے اذہان پر غالب نہیں آ گئی تو وہ آپ کو بتائیں گے کہ اہل حدیث

میں بحمد اللہ یہ دھاندلی نہیں ہے بلکہ ائمۂ جرح و تعدیل اور اہل نقد و نظر کے انکار سے استفادہ یہاں کا شعار ہے۔

اوّل تو ہم قرآن اور حدیث، قرآن اور عقل سلیم میں تعارض کے قائل ہی نہیں لیکن اگر بظاہر کہیں تعارض محسوس ہو تو اصول کی حد تک یقیناً یہی بات ہے کہ حدیث کا درجہ قرآن عزیز کے بعد ہی ہونا چاہیے۔ اصول حدیث میں تطبیق، ترجیح، توقف کی ساری صورتیں موجود ہیں **كَمَا فُصِّلَ فِي مَوْضِعِهٖ.**

ہاں استدلال اور اخذِ مسائل کے وقت ہمارے نزدیک حدیث وحی ہے اور اس کا اُسی طرح آنحضرت ﷺ کو علم دیا گیا جیسے قرآن کا۔ آنحضرت ﷺ نے قرآن کے الفاظ ہم تک پہنچائے اور احادیث کا مفہوم، اور ہمارا ایمان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس باب میں پوری امانت اور صحیح دیانت سے کام لیا ہے۔ یہی حال صحابہ رضی اللہ عنہم کا تھا، ہمیں ان کے علم و دیانت پر پورا یقین ہے۔ (**عَنْ حَسَّانِ ابْنِ عَطِيَّةَ كَانَ جِبْرِيْلُ يَنْزِلُ بِالْقُرْاٰنِ وَالسُّنَّةِ وَيُعَلِّمُهُ إِيَّاهَا كَمَا يُعَلِّمُهُ الْقُرْاٰنَ.**) [1] (ص ۳۴۰ شاطبی ج ۴)۔ جامع بیان العلم ابن عبد البر ”جبریل قرآن اور سنت دونوں کو لے کر نازل ہوتے، آنحضرت ﷺ کو سنت بھی قرآن کی طرح سکھاتے“۔ اس لحاظ سے ہم وحی میں تفریق کے قائل۔ قرآن اور حدیث دونوں مآخذ ہیں اور بیک وقت مآخذ ہیں۔ اسی لحاظ سے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ((**أُوْتِيْتُ الْقُرْاٰنَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ.**)) [2] حلت و حرمت اور بعض دوسرے مسائل میں سنت کو جو مستقل حیثیت حاصل ہے اس پر ہمیں پورا یقین ہے۔ اس مقام پر جناب کا یہ ارشاد بالکل مجمل ہے۔

”دین میں ان (احادیث) کی اصلی جگہ قرآن کے بعد ہے نہ کہ اس سے پہلے یا اس

---

[1] **الصواعق المرسله**' ۲/ ۳۴۰؛ **الموافقات للشاطبی**، ۳۴۴،۳۴۵؛ **والدارمی**' المقدمة' باب السنة قاضية على كتاب الله رقم ۵۹۴؛ **ابن المبارک فی الزھد**، ماروا ہ نعیم فی نسخته علی ماروا ہ المروزی عن ابن المبارك فی كتاب الزهد ص:۲۳؛ **اللالكائی**' فی شرح اصول اعتقاد اهل السنة والجماعه: ۱/۹۳' رقم ۹۹؛ **الخطيب فی الكفاية**' باب ماجاء فی التسوية بين حكم كتاب الله وحكم سنة رسول الله فی وجوب العمل ص:۱۲؛ **صححه ابو عبيدة**' مشهور بن حسن آل سلمان؛ **مراسيل ابو داؤد**، باب فی البدع' ص:۱۹۴' رقم: ۴۸۷۔ [2] **ابو داود**' كتاب السنة باب فی لزوم السنة: ۴۶۰۴؛ **احمد فی مسنده**' ۴/ ۱۳۱ رقم ۱۷۱۷۴؛ **مسند الشاميين** '۲/ ۱۳۷؛ **البيهقی فی دلائل النبوة**' ۶/ ۵۴۹؛ **ابن حبان**' فی صحيحه المقدمة باب الاعتصام السنة: ۱/ ۱۸۹' رقم ۱۲۔

کے برابر، اگر کوئی شخص یہ ترتیب الٹ کران کوقرآن سے پہلے کر دے یا قرآن کے برابر کر دے تو وہ اسی غلو میں مبتلا ہو جائے گا جس میں اہل ظاہر مبتلا ہوئے جنہوں نے ہر حدیث کو حدیثِ متواتر بنا کے رکھ دیا۔''

اس چیستان کی تشریح فرمائیے۔ ہماری نظر میں تو کوئی ایسا آدمی نہیں ''جو حدیث ہی کو سب کچھ سمجھے، قرآن اور اجتہاد کو نظر انداز کر دے۔'' [1] نہ ہم نے کوئی ایسا آدمی دیکھا جو تعارض کے وقت یا طریقۂ ثبوت کے لحاظ سے حدیث کو قرآن سے مقدم سمجھے، نہ کوئی ایسا آدمی ملا جو ہر حدیث کو متواتر سمجھے، اہل ظاہر سے ابن حزم کی کتابیں اہلِ علم کی نظر میں ہیں۔ محلّٰی چھپ چکی، الاحکام بازار میں موجود، جمہرۃ الانساب ملتی ہے ہمیں تو ان دعاوی کی صداقت مشتبہ معلوم ہوتی ہے اور بچارے اہل ظاہر پر یہ کھلی تہمت ہے، مولانا ایسے متین آدمی کے قلم سی ایسے الفاظ نہ نکلتے تو بہتر ہوتا۔ وہ قیاس کے سوا باقی تمام مآخذ کو مانتے ہیں۔

غایت یہی ہے کہ بعض ناموں سے کسی خاص طریق فکر کے ساتھ تعلق اور ایک مسلک کے ساتھ ربط معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص جماعت اسلامی میں داخل ہوتا ہے تو اس کا یہ مطلب ہم سمجھ سکتے ہیں کہ یہ شخص مولانا مودودی کی قیادت کو موجود قیادتوں سے بہتر سمجھتا ہے، ان پر اسے زیادہ اعتماد ہے مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں ہوگا کہ وہ مولانا مودودی کو آنحضرت ﷺ یا صحابہ رضی اللہ عنہم یا ائمہ پر ترجیح دیتا ہے۔ اسی طرح ایک اہلحدیث کے متعلق یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ حنفی یا شافعی طریق فکر کی بجائے ائمہ حدیث کے طریق فکر کو ترجیح دیتا ہے۔ عملی زندگی میں ائمۂ حدیث پر اعتماد کرتا ہے، مگر یہ بدگمانی کیوں کی جائے کہ وہ حدیث ہی کو حجت سمجھتا اور قرآن اور اجتہاد کو نظر انداز کرتا ہے۔ ان صفحات میں مولانا کا طریق بحث بہت دلخراش ہے اور ثقاہت سے گرا ہوا۔ ہمیں متانت اور سنجیدگی سے شکوہ ہے کہ اُس نے مولانا کا ساتھ کیوں چھوڑ دیا۔

دُوسری شرط

استفادہ کی دوسری شرط میں مولانا نے فرمایا کہ ''آنحضرت ﷺ کے بعد کسی کو معصوم نہ سمجھے'' [2] یا اللہ! یہ کس نے کہا؟ کب کہا؟ کیسے کہا؟ واقعہ صرف اس قدر ہے کہ ائمہ حدیث

[1] ترجمان القرآن '۴۵' شمارہ نمبر ص ۱۴۱: ۱ اکتوبر ۱۹۵۵ء

[2] ترجمان القرآن '۴۵ / شمارہ نمبر ۲ ص: ۱۴۳ 'اکتوبر ۱۹۵۵ء

نے تنقیدِ حدیث کے متعلق صدیوں محنت فرمائی۔ احادیث کی صحت، ضعف، حسن، ارسال، انقطاع، شاذ اور مقبول کے متعلق کچھ عقلی، کچھ لغوی اور عرفی فیصلے فرمائے، ان فیصلوں کو صدیوں سے اہلِ علم قبول فرما رہے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان کی بلاوجہ مخالفت نہ کی جائے، اگر اختلاف ہو تو دلیل سے کیا جائے، اہلِ فن کے فیصلوں کی روشنی میں کیا جائے۔ اس کا نام عصمت نہیں، اس بدگمانی کے لیے ائمہ حدیث میں کوئی گنجائش نہیں۔ پورے وثوق اور پوری ذمہ داری سے گزارش ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد کسی کے متعلق عصمت کا خیال تک نہیں محدثین بھی انسان ہیں اور جماعت اسلامی کی قیادت بھی انسان۔ البتہ اسی تعصب سے اختلاف ہے کہ ایک جماعت اپنی عقیدت مندی سی کسی اپنے بزرگ یا قائد کو خدا کا مزاج شناس سمجھ لے یا ''رسول کا مزاج شناس'' تصور کر لے، پھر اسے اختیار دے دے کہ اصول محدثین کے خلاف جس حدیث کو چاہے قبول کرے، جسے چاہے رد کر دے یا کوئی عالم' قائد بلاوجہ کسی موضوع یا مختلق' مرسل یا منقطع حدیث کے متعلق یہ دعویٰ کر دے کہ میں نے اس میں ''ہیرے کی جوت دیکھ لی ہے''۔ یہ مضحکہ خیز پوزیشن ہمیں یقیناً ناگوار ہے۔ ہم ان شاء اللہ آخری حد تک اس کی مزاحمت کریں گے اور سُنّتِ رسول ﷺ کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کی کوشش کریں گے۔

ہمیں معلوم ہے، ہیرا ملے یا اس کی جوت، یہ صرف وہی جوہری جان سکتے ہیں جن کا اوڑھنا بچھونا سنت ہے اور جن کا شب و روز کا مشغلہ سُنّت ہے مزاج شناسی بھی انہی کا حصہ ہے۔ مولانا فرمائیں متعصب وہ لوگ ہیں جو قواعد اور اُصول کا احترام کرتے ہیں یا وہ حضرات جو مفت میں جوہری بن جائیں یا ان کے دوست اُنہیں مزاج شناس رسول ﷺ بنا دیں

﴿اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ﴾ [1]

یہ فن کی قدر اور ہنر کے احترام کا مسئلہ ہے، اس میں عصمت کی کوئی بات نہیں یہ ترجمانی غلط ہے اور بالکل غلط...... اور انتقامی جذبہ کی پیداوار۔ مولانا نے اس مقام پر اہلِ فن کے متعلق جن شبہات کا اظہار فرمایا ہے، اخبارِ آحاد کے خلاف جو احتمالات پیدا کیے اور انسانی فہم میں جن غلط فہمیوں کی نشاندہی فرمائی ہے اسے ممکن سمجھنے کے بعد عرض ہے کہ جو لوگ آج صدیوں کے بعد

[1] ۵۳/ النجم: ۲۳۔

ان اغلاط پر مواخذہ کریں گے، ان اغلاط اور غلط فہمیوں کی ٹوہ لگائیں گے۔ آیا مولانا اور ان کے رفقا ان کے متعلق عصمت کا دعویٰ کر سکتے ہیں؟ وہ یقین فرما سکتے ہیں کہ ان مواخذات میں کوئی لغزش نہیں؟ یقیناً آپ ایسا فرمائیں گے تو خدارا بتایا جائے کہ آپ ظن کو صدیوں کے ظن سے ٹکرا کر ایک ظنی نتیجہ پر پہنچتے ہیں اور اسے ''ہیرے کی جوت'' یا ''رسول کی مزاج شناسی'' سے تعبیر فرماتے ہیں لیکن اگر اصحاب وقت کے بروقت فیصلے اور صدیوں کی محنت کے نتائج پر اعتماد کیا جائے تو اس کا نام آپ کی اصطلاح میں عصمت کا دعویٰ ہے ﴿مَالَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ﴾ [1] متقدمین ائمہ کی تنقید اور دلائل پر کوئی یقین کرے تو اس پر عصمت کی پھبتی اور آج اپنی معلومات کی روشنی میں صدیوں بعد کوئی ظنی فیصلہ ان قانونی فیصلوں کے خلاف آپ کریں تو اس کا نام ہیرے کی جوت۔ یہ جرأتیں آپ پر تنقید کرنے والوں کے لیے بدگمانی کی راہ کھولتی ہیں۔

فَاحْفَظْ وُقِيتَ فَتَحْتَ قَدَمِكَ هُوَّةٌ
كَمْ قَدْهَوىٰ فِيْهَا مِنَ الْاِنْسَانِ

وقت کی ضرورت

ایسے وقت میں جب حدیث اور سنت کے خلاف لادینی حلقوں میں ایک طوفان بپا ہے، اس قسم کی کمزور اور بے اصل باتیں کرنا مناسب نہیں۔ یہ وقت باہم خطابات کی تقسیم کا نہیں اور نہ ہی بحث سے اس طرح پہلو تہی کرنا اس وقت قرین مصلحت ہے۔ یہ معذرت کا انداز اور چور دروازوں کی طرف رہنمائی نہ حدیث کی خدمت ہے نہ سنت کی حمایت۔ پچھلے دنوں مولانا مودودی کی ایک دو بے محل تقریروں سے اخبارات میں کچھ ہنگامہ ہوا تو ہمارے بعض ''اہلحدیث'' دوست جواب جماعت اسلامی کے ہو چکے ہیں، مولانا کے نظریہ کی دیانتہً کھلی حمایت تو نہ کر سکے مگر اس طرح پردہ پوشی فرمائی کہ ''پہلے علما میں بھی بعض ایسا کہتے تھے۔'' بعض حضرات ''مزاج شناسی'' کے حوالوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے، حالانکہ مناسب یہ تھا کہ شک کیا جائے لیکن حق کا احترام اور سنت کی حمایت وقت کی شدید ترین ضرورت ہے جسے کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں ہونا چاہیے۔ دنیا میں اسلامی نظام بپا ہونے کی بھی صرف یہی صورت ہے کہ سنت پر جس محاذ پر حملہ ہو، دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مدافعت کی جائے۔ اپنی

[1] ٦٨/ القلم: ٣٦۔

انصاف پسندی اور وسعت ظرف کے ثبوت میں معذرت کا انداز ضرورت وقت کے بالکل خلاف ہے، خود مولانا کو بھی ایسے خوشامد پسند حضرات سے بچنا چاہیے جن کو صرف یہی فکر ہو کہ ان کی وفاداری مشتبہ نہ ہو جائے۔

رُواۃ کی عصمت

رواۃ نہ معصوم ہیں نہ آج تک کسی نے ان کی عصمت کا دعویٰ کیا، نہ ایسا ممکن ہے، البتہ مجموعی لحاظ سے فن حدیث پر عصمت کا ظن غالب ہے۔ جس طرح حفاظ کو اللہ تعالیٰ نے توفیق عنایت فرمائی کہ وہ قرآن کو محفوظ رکھ سکیں، یعنی ہر حافظ معصوم نہیں، لیکن قرآن کے حفظ کی اللہ تعالیٰ نے ان کو توفیق دی، اسی طرح حفاظِ حدیث کو اللہ تعالیٰ نے توفیق مرحمت فرمائی کہ وہ اس کی حفاظت فرما سکیں۔ اجماعِ اُمت میں ہر فرد معصوم نہیں لیکن بحیثیت مجموعی اجماع میں مجتہدین کو عصمت کا مقام حاصل ہو جاتا ہے تلقی بالقبول میں بھی یہی صورت ہے۔ اگر حدیث دین ہے تو اس کی حفاظت کا ذمہ دار حق تعالیٰ کو ہونا چاہیے۔ یہ حفاظت، حفاظِ حدیث ہی کی معرفت سے ہوئی ہے، اس لیے مجموعی حفاظت اور اجتماعی عصمت سے ان کو یقیناً حصہ ملا ہے۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ اگر اس سے کوئی چیز ضائع ہو چکی ہے تو اس کی ضرورت نہ تھی اور جس چیز کی ضرورت تھی اسے محفوظ رکھنے کی توفیق اللہ تعالیٰ نے ائمہ حدیث کو عطا فرمائی۔ ﴿ذَالِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ﴾ [1]

حدیث کو تنقیدی نگاہ سے پڑھنے کا مطلب

اس عنوان کے تحت مولانا نے فرمایا ہے کہ ہر حدیث [2] پر تنقید ضروری نہیں ”تنقید کی ضرورت وہاں پیش آتی ہے جہاں کوئی ایسی حدیث آ جاتی ہے جو سنتے ہی طبیعت کو کھٹکتی ہے جو دین کے مسلمات اور شریعت کے معروفات کے خلاف معلوم ہوتی ہے جس کو عقل عام قبول کرنے سے اول وہلہ میں اِبا کرتی ہے“ الخ۔ اس ضمن میں مثال کے طور پر مولانا نے تین احادیث کا ذکر فرمایا ہے (۱) (حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تین مرتبہ جھوٹ بولنے کی روایت۔ (۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قرآن کی آیات کے ساتھ تِلْکَ الْغَرَانِیْقُ الْعُلٰی کے الفاظ پڑھ

---

[1] ۵۷/الحدید: ۲۱۔ [2] ترجمان القرآن ۴۵/ شمارہ نمبر ۲ ص: ۱۴۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء

دینے لی روایت، (۳) یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ملک الموت کو تھپڑ مارنے کی روایت) ❶

مولانا نے جو فرمایا ایک حد تک مناسب ہے لیکن مولانا ہر ناپسندیدہ مقام پر بچارے اہل ظاہر کا ذکر فرما دیتے ہیں، شاید اس لیے کہ اس طریق فکر کا ہمارے ملک میں کوئی موید نہیں۔ جہاں تک اہل ظاہر کی کتابوں کا تعلق ہے ان میں یہ چیز موجود نہیں جسے مولانا اہل ظاہر کی طرف منسوب فرما رہے ہیں۔ اہل ظاہر سے بعض مقامات پر لغزش ہوئی ہے لیکن وہ اتنے گئے گزرے نہیں جس طرح جناب کے ارشاد سے ظاہر ہوتا ہے۔ ظاہری سکول فکر کے دو بزرگ عام طور پر مشہور ہیں، ابن حزم اندلسی اور امام داؤد ظاہری۔ یہ لوگ قیاس کو حجت شرعی تو بےشک نہیں جانتے لیکن حدیث میں ان کا مقام ہم ایسے مدعیان علم وعقل سے کہیں بلند ہے۔ اس اندازِ تنقید سے احتیاط مناسب ہے جو مولانا اصلاحی نے اختیار فرمایا ہے۔

تین احادیث

جن تین احادیث کے متعلق مولانا نے فرمایا ہے کہ عقل عام ان کو قبول کرنے سے اِبا کرتی ہے۔ مناسب تو یہ تھا کہ ایسی مثالیں ذکر کرنے کی بجائے مولانا اپنے رفقا سے مشورہ فرما کر ایک ایسا مجموعہ شائع کر دیتے جس میں وہ تمام احادیث جمع کر دی جاتیں جو مولانا کی طبیعت کو کھٹکتی ہیں یا عقل عام ان کو قبول کرنے سے اِبا کرتی ہے تا کہ کم عقل لوگ اندازہ کر سکتے کہ ایسی احادیث کی مقدار کتنی ہے اور کس کس عقلمند کی عقل کو یہ احادیث کھٹکتی ہیں؟ ممکن ہے کسی کی سمجھ میں کچھ آتا تو وہ آپ سے کچھ عرض کر سکتا۔ عقل اور احادیث میں جب بھی جنگ بپا کرنے کی کوشش کی گئی، اہل علم نے تطبیق کی صورت پیدا کر دی اور باہم صلح ہو گئی۔ اعلام الموقعین، تاویل مختلف الحدیث یا مشکل الآثار ایسی کتابیں ان شبہات کے پیش نظر لکھی گئیں اور اپنے وقت میں بہت حد تک کامیاب ثابت ہوئیں۔

مولانا نے جن احادیث کا مثال کے طور پر ذکر فرمایا ہے ان کے متعلق مختصراً گزارش مناسب معلوم ہوتی ہے۔ حدیث غرانیق ❷ باتفاقِ محدثین، اصول محدثین کے مطابق ساقط

---

❶ ترجمان القرآن' ٤٥/ شمارہ نمبر:٢ ص ١٤٤ اکتوبر ١٩٥٥ء۔

❷ تفسیر الطبری' سورۃ الحج :آیۃ ٥٢، ١٧٤/٩ رقم ٥٣٢٧؛ الدر المنثور' سورۃ الحج ٥٢ /٤/ ٦٦١؛ ابن کثیر' سورۃ الحج:آیۃ ٥٢ /٣/ ٣٠٨۔

الا عتبار ہے اور جن الفاظ سے ائمہ حدیث نے اسے قابلِ استناد سمجھا ہے وہ نہ طبیعت کو کھٹکتی ہے نہ عقلِ عام اس سے اِبا کرتی ہے۔ معاریض ابراہیم علیہ السلام کی روایت اکثر کتب حدیث میں مروی ہے ❶ اس کی سند اصولِ محدثین کے مطابق صحیح ہے۔ ائمہ حدیث سے فنی طور پر کسی نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔

(الف) تعجب ہے ائمہ حدیث میں سے یہ حدیث نہ کسی کی طبیعت کو کھٹکی نہ ان کی "عقلِ عام" نے اس سے اِبا کیا۔

(ب) متقدمین فقہائے سنت سی بھی کسی نے اس پر اشتباہ کا اظہار نہیں کیا غا[لباً] رازی پہلے آدمی ہیں جن کے مزاج پر یہ حدیث گراں گزری اور انہوں نے دبے [لفظوں] اس کے انکار کی کوشش کی، لیکن امام نے اس چیز پر غور فرمایا کہ ان رواۃ سے اور بھی [بہت] سی روایات مروی ہیں بنابریں جس عیب کی بنا پر اسے رد کیا جائے گا اس کا اثر باقی احادیث پر بھی پڑے گا۔ اس لیے یہ رد نتائج کے لحاظ سے آسان نہیں۔

(ج) ابن قتیبہ (۲۷۶ھ) نے ابراہیم بن سیار نظام جیسے معتزلی کے شبہات کا ذکر کیا ہے۔ نظام کہتے ہیں کہ اکابر صحابہ (حذیفہ بن یمان) نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس جھوٹ بولا۔ ابن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تعریض توریہ ہے اور بعض اوقات جھوٹ کی بھی اجازت ہے۔ اس ضمن میں الزام کے طور پر انہوں نے ابراہیم علیہ السلام کی ان معاریض کا ذکر فرمایا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نظام ایسے غالی معتزلی کو بھی اس وقت اس حدیث پر اعتراض نہ تھا۔ نہ ہی یہ اس کی عقل کو کھٹکتی تھی۔ ❷

(د) معتزلہ اور متکلمین عقل کی پرستش اصول اور عقائد کے مسائل میں کرتے تھے۔ اور صفاتِ باری کے مباحث میں سنت ان کی عقول پر گراں گزرتی تھی مگر فروع میں ان کی عقلوں سے اس احساس کا دباؤ کم ہو جاتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ مسائل بھی ظنی ہیں۔ ان پر ظنی دلائل سے استدلال صحیح ہے۔ آج کے عقل پرست حضرات نہ اصول میں حدیث کو معاف

---

❶ بخاری' کتاب التفسیر باب ﴿ذرية من حملنا مع نوح﴾ رقم: ٤٧١٢؛ الترمذی' کتاب القیامۃ باب ماجاء فی الشفاعه رقم: ٢٤٣٤؛ مسند احمد' ١/٢٨١؛ ابو داؤد الطیالسی' ٤/٤٣٠ رقم ٢٨٣٤؛ دلائل النبوۃ للبیہقی' ٥/٤٧٧ ماجاء فی تحدث رسول لله بنعمة۔

❷ تاویل مختلف الحدیث' ص ٣٥۔٣٦ باب ذکر اصحاب الکلام و اصحاب الرأی۔

فرماتے ہیں نہ فروع میں۔ عقول پر یہ اپایا کھٹکا دراصل موسم کی بات ہے۔

(ھ) فقہائے حدیث اور ائمہ اور شرّاح حدیث اس امر پر قریباً متفق ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جھوٹ نہیں بولا قرآن وسنت صراحۃً اس پر شاہد ہیں کہ یہ جو کچھ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: تعریض اور توریہ کے طور پر فرمایا اور یہ طریقۂ گفتگو ادبیات کی جان ہے۔ دینی، سیاسی، کاروباری طبقے سب اس کا کھلے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے جس اختصار اور سنجیدگی سے اس کا تذکرہ فرمایا ہے اہل تحقیق کے لیے اس میں تسکین کا سامان موجود ہے۔

فَاِنْ قِيْلَ كَيْفَ سَمَّاهَا اِبْرَاهِيْمُ كَذِبَاتٍ وَهِيَ تَوْرِيَةٌ وَ تَعْرِيْضٌ صَحِيْحٌ...... وَقَدْ فَتَحَ اللّٰهُ الْكَرِيْمُ بِالْجَوَابِ عَنْهُ. فَنَقُوْلُ الْكَلَامُ لَهٗ نِسْبَتَانِ نِسْبَةٌ اِلَى الْمُتَكَلِّمِ وَقَصْدِهٖ وَاِرَادَتِهٖ وَنِسْبَةٌ اِلَى السَّامِعِ وَاِفْهَامُ الْمُتَكَلِّمِ اِيَّاهُ مَضْمُوْنَهٗ فَاِذَا اَخْبَرَ الْمُتَكَلِّمُ بِخَبَرٍ مُطَابِقٍ لِلْوَاقِعِ وَقَصَدَ اِفْهَامَ الْمُخَاطَبِ اِيَّاهُ صَدَقَ بِالنِّسْبَتَيْنِ فَاِنَّ الْمُتَكَلِّمَ اِنْ قَصَدَ الْوَاقِعَ وَقَصَدَ اِفْهَامَ الْمُخَاطَبِ فَهُوَ صِدْقٌ مِنَ الْجِهَتَيْنِ وَاِنْ قَصَدَ خِلَافَ الْوَاقِعِ وَقَصَدَ مَعَ ذَالِكَ اِفْهَامَ الْمُخَاطَبِ خِلَافَ مَا قَصَدَ بَلْ مَعْنًى ثَالِثًا لَا هُوَ الْوَاقِعُ وَلَا هُوَ الْمُرَادُ فَهُوَ كَذِبٌ مِنَ الْجِهَتَيْنِ بِالنِّسْبَتَيْنِ مَعًا. وَاِنْ قَصَدَ وَمَعْنًى مُطَابِقًا صَحِيْحًا وَقَصَدَ مَعَ ذَالِكَ التَّعْمِيَةَ عَلَى الْمُخَاطَبِ وَاِفْهَامِهٖ خِلَافَ مَا قَصَدَهٗ فَهُوَ صِدْقٌ بِالنِّسْبَةِ اِلٰى قَصْدِهٖ كَذِبٌ بِالنِّسْبَةِ اِلٰى اِفْهَامِهٖ وَمِنْ هٰذَا الْبَابِ التَّوْرِيَةُ وَالْمَعَارِيْضُ. وَبِهٰذَا الملق عَلَيْهَا اِبْرَاهِيْمُ الْخَلِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ اِسْمَ الْكَذِبِ مَعَ اَنَّهُ الصَّادِقُ فِيْ خَبَرِهٖ وَلَمْ يُخْبِرْ اِلَّا صِدْقًا فَتَاَمَّلْ الخ [1]

امام کا مطلب یہ ہے کہ سچ اور جھوٹ کی تشخیص میں نفس الامر اور متکلم کے قصد اور ارادہ کو بھی دخل ہے اس لحاظ سے اس کی تین صورتیں ہوں گی۔ متکلم صحیح اور واقع کے مطابق کہے اور

[1] مفتاح دار السعادة لا بن قيم' فصل وانما خلقه او حده لحكمه ۲/ ۳٦۔

مخاطب کو وہی سمجھانا چاہے جو فی الحقیقت ہے۔ یہ دونوں لحاظ (واقعہ اور ارادہ سے سچ ہے اور اگر متکلم خلاف واقعہ کہے اور مخاطب کو اپنے مقصد سے آگاہ نہ کرنا چاہے بلکہ ایک تیسری صورت پیدا کر دے جو نہ صحیح ہو نہ ہی متکلم کا مطلب اور مراد ہو، یہ دونوں لحاظ سے جھوٹ ہوگا لیکن اگر متکلم صحیح اور نفس الامر کے مطابق گفتگو کرے لیکن مخاطب کو اندھیرے میں رکھنا چاہے اور اپنے مقصد کو اس پر ظاہر نہ ہونے دے اسے تعریض اور توریہ کہا جاتا ہے۔ یہ متکلم کے لحاظ سے صدق ہے اور تفہیم کے لحاظ سے کذب ہے۔ اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے کذب سے تعبیر کیا۔ درآں حالیکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کچھ فرمایا وہ حقیقت میں صحیح تھا۔ شناعتِ عامہ سے بچنے کے لیے یہی مناسب طریق تھا۔

نامناسب نہ ہوگا، یہاں اگر حافظ ابن قیم کے استاذ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی بھی ''صدق وکذب خبر'' سے متعلق نفیس تحقیق پیش کر دی جائے۔

الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح ص۸۸ ج۴ میں فرماتے ہیں:

(وَالْخَبَرُ تَارَةً يَكُوْنُ مُطَابِقًا لِمُخْبَرِهِ كَالصِّدْقِ الْمَعْلُوْمِ اَنَّهُ صِدْقٌ وَتَارَةً لَايَكُوْنُ مُطَابِقًا لِمُخْبَرِهِ كَالْكِذْبِ الْمَعْلُوْمِ اَنَّهُ كَذِبٌ وَقَدْتَكُوْنُ الْمُطَابَقَةُ فِيْ عِنَايَةِ الْمُتَكَلِّمِ وَقَدْيَكُوْنُ فِيْ اَفْهَامِ الْمُخَاطَبِ وَاِذَا كَانَ اللَّفْظُ مُطَابِقًا لِمَا عَنَاهُ الْمُتَكَلِّمُ وَلَمْ يُطَابِقْ اَفْهَامَ الْمُخَاطَبِ فَهٰذَا اَيْضًا قَدْ يُسَمّٰى كَذِبًا وَقَدْ لَايُسَمّٰى وَمِنْهُ الْمَعَارِيْضُ لٰكِنْ يُبَاحُ لِلْحَاجَةِ) [1]

(و) بعض اہل علم نے دوسری راہ بھی اختیار فرمائی ہے، ان کا خیال ہے کہ کذب ہر حال میں حرام نہیں۔ بسا اوقات ضرورۃً شارع نے اس کی اجازت دی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ((لَيْسَ الْكَاذِبُ الَّذِيْ يُصْلِحُ بَيْنَ النَّاسِ)) [2] احادیث میں بعض مصالح کا

[1] الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح' ۴/۲۸۸ فصل جماع الکلام فی النبوۃ۔

[2] بخاری' کتاب الصلح باب لیس الکاذب الذی یصلح بین الناس رقم ۲۶۹۲؛ مسلم' کتاب البر باب تحریم الکذب وبیان مایباح منہ ۶۶۳۳؛ الترمذی' کتاب البر باب ماجاء فی اصلاح ذات البین ۱۹۳۸؛ مسند احمد' ۶/۴۰۳؛ ابن حبان' کتاب الحظر والاباحۃ باب الکذب ۱۳/۴۰ رقم ۵۷۳۳؛ الطیالسی' ۱۷۶۱؛ کتاب الکفایۃ للخطیب' ص۱۸۰ باب ذکر الروایۃ عمن کان لا یری تخفیف۔

صراحۃً بھی ذکر آیا ہے۔ ابن حزم کا رجحان الفصل میں اسی طرف ہے۔ نئے لوگوں میں سے حسن احمد الخطیب نے ''فقہ الاسلام'' میں اس مسلک کا ذکر فرمایا ہے:

وَمِنْ ذَالِکَ اِبَاحَتُهُمُ الْكَذِبَ اِذَا تَرَتَّبَ عَلَى الصِّدْقِ مُفْسَدَةٌ عَظِيْمَةٌ وَقَدْ فَصَلَ الْحَمْوِیُ فِی الْاَشْبَاهِ الْكَلَامِ فِی ذَالِکَ فَقَالَ مَاخُلَاصَتُهُ اِنَّ الْكَذِبَ يَجُوْزُ فِی ثَلٰثَةِ مَوَاضِعَ فِی الْاِصْلَاحِ بَيْنَ النَّاسِ وَفِی الْحَرْبِ وَعَلٰی الزَّوْجَةِ لِاِصْلَاحِهَا الخ، وَيُرَادُ بِذَالِکَ اِسْتِعْمَالُ الْمَعَارِيْضِ لَا الْكَذِبِ الصَّرِيْحِ وَنُقِلَ اَنَّ الْكَذِبَ يُبَاحُ لِاِحْيَاءِ حَقٍّ الخ (ص ۲۳۰)

کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے مگر زندگی میں ایسے مواقع آتے ہیں جب انسان پوری صداقت کا اظہار نہیں کر سکتا۔ اگر وہ اس کے اظہار پر اصرار کرے تو اس کی راہ میں مزید مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں جن میں دیانت کو نقصان پہنچ سکتا ہے، جس کا قائم رکھنا ضروری ہے۔ اپنے ذاتی مقاصد کے لیے تو واقعی اس رخصت سے استفادہ معصیت ہے لیکن دینی اور ملی ضرورتوں کے لیے یہ گنجائش ناگزیر ہے۔ (اِذَا ابْتُلِیَ اَحَدُکُمْ بِبُلْيَتَيْنِ فَلْيَخْتَرْ اَهْوَنَهُمَا) میں بھی یہی اصل کارفرما ہے۔

(ر) تعریضات کی راہ زندگی کا ایسا لازمہ ہے کہ اس سے بچنا سخت مشکل ہے آپ اپنا یہی مضمون ملاحظہ فرمائیے۔ آپ نے سوال ٦ کا جواب دیتے ہوئے معذرت فرمائی ہے کہ ''جماعت اسلامی سنت کی کیوں اب تک کوئی نمایاں خدمت نہیں کر سکی۔'' جماعت کا کام بہت آگے بڑھ جاتا لیکن جو حضرات اپنے آپ کو حدیث کی خدمت کا ٹھیکے دار سمجھے ہوئے ہیں، ان کو یہ غم کھانے لگا کہ اگر جماعت نے یہ کام سنبھال لیا تو پھر وہ کس چیز کا نام لے کر کچھ لوگوں کو اپنے ارد گرد جمع رکھ سکیں گے۔

مولانا کی تعریض

مولانا! اس سے قطع نظر کہ آپ ایسے متین اور عالم آدمی کے لیے یہ طعن و تشنیع کا انداز مناسب ہے یا نہیں، یہ تو جناب کو بھی معلوم ہے اور ہم بھی جانتے ہیں کہ اس ملک میں حدیث

کی خدمت کا کوئی ٹھیکہ نہیں، جس چیز کو آپ مخاطب سے چھپانا چاہتے ہیں وہ اہم اور نمایاں خدمات ہیں جو کتاب وسنت کی اشاعت میں جماعت اہلحدیث سے ظاہر ہوئیں، دروس، مکاتب اور مطابع کے ذریعہ لاکھوں آدمی قرآن اور حدیث کے فیضان سے مستفیض ہوئے۔
دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جماعت اسلامی اس راہ میں لفاظی کے سوا کچھ نہیں کر سکی۔لیکن آپ سائل کے سامنے یہ ظاہر کرنا پسند نہیں فرماتے بلکہ اسے اندھیرے میں رکھنے کے لیے ''ٹھیکیدار'' کی تعریض اختیار فرمائی ہے، میں تو اسے تعریض ہی کہوں گا۔لیکن اگر آپ میں جرأت ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح اعتراف فرمایئے کہ میں نے جھوٹ بولا ہے تفنن برطرف تعریضات سے اعراض فرما کر انکارِ حدیث کے لیے چور دروازے بنانے کی جرأت نہ پیدا کیجیے۔آپ ایسے اہل علم بزرگوں کو جب آپ کے اتباع یہ حیل بناتے دیکھیں گے تو ان کی جرأتیں اور بڑھ جائیں گی۔

زنند لشکریانش ہزار مُرغ بہ سیخ

ختم نبوت کی تحریک میں آپ حضرات کا موقف عقلِ عام کی رسائی سے بالا تھا۔آپ کے بیانات سب اسی نوعیت کے ہے۔لوگ انہیں جھوٹ دھوکہ کہتے ہیں۔معلوم ہے کہ عوام کے سامنے اپنی جماعت کو بچانے اور لغزشوں کو چھپانے کے لیے یہ تعریضی بیانات دینے کے لیے آپ مجبور تھے ''عقلِ عام'' کے تقاضے جب عقلِ عوام سے ٹکرانے لگیں تو مشکلات سے مخلصی کے لیے تعریضات کی راہ کھلی رہنی چاہیے اور اگر اسے خیالی تصوف اور تصوری زہد و ورع سے روکا گیا تو زندگی میں ایک ایسا خلا نمودار ہوگا جسے پاٹنا ممکن ہوگا۔
ہجرت کے سفر میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ تعریض فرما کر ''رَجُلٌ يَهْدِينِي السَّبِيلَ'' [1] دانش مندی کی انتہا کر دی اور زبان اور ادب میں ایک مفید اضافہ فرمایا۔آپ حضرات بھی عجیب ہیں، ایک طرف تو چاہتے ہیں کہ لوگ کھلے ذہن سے سوچیں لیکن جب سوچنے کا وقت آجاتا ہے تو آپ پر مصنوعی تصوف کا حملہ ہو جاتا ہے اور آپ عقل عام کی گود میں پناہ لیتے ہیں اور دوسروں پر طعن فرمانا شروع کر دیتے ہیں۔

[1] بخاري، كتاب مناقب الانصار: باب هجرة النبي واصحابه الى المدينه ٣٩١١؛ مسند احمد، رقم ٣/١٢٢-٢١١؛ دلائل النبوة، باب ماجاء في دخول عبدالله بن سلام: ٢/٥٢٦۔

(ح) میرا ذاتی تجربہ معاریض ابراہیمی علیہ السلام کے متعلق یہ ہے کہ جب تک بچپن غالب تھا اور عقل ناتمام تھی، کذب کا نام سن کر تشویش ہوتی تھی۔ اساتذہ اور رُفقا سے بحث ہوتی رہی لیکن جب تک تجربہ کی زندگی میں قدم رکھا۔ عمل نے تمام شبہات دور کر دیئے۔ تعریض اور توریہ کو عملی دُنیا کے ماحول پر محیط پایا۔ یہی وجہ ہے کہ انبیا نے بوقت ضرورت اسے استعمال فرمایا، صلحا کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی۔ پس ہماری ''عقل عام'' کو تو اس حدیث سے کوئی کھٹکا محسوس نہیں ہوتا، بلکہ دین کی تکمیل پر مزید یقین ہوتا ہے کہ اس میں اس زاویہ کے لیے بھی رہنمائی کا سامان موجود ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تھپڑ ❶

اس عنوان پر کچھ عرض کرنے سے قبل مولانا اور ان جیسے ''محققین'' کی خدمت میں گزارش ہے کہ یہ مسئلہ بھی کچھ آج نہیں چھڑا، تیسری صدی ہجری میں ''درایت'' کے ہیرو حضرات معتزلہ اس حدیث کو بھی مشکوک بنانے کی کوشش میں مصروف تھے اور حدیث پاک کے محافظ اللہ تعالیٰ نے محدثین کو توفیق دی کہ وہ اس حدیث کا صحیح مطلب بتا کر ان لوگوں کے دانت کھٹے کر دیں۔ چنانچہ اس زمانے کے جن محدثین نے اس حدیث کا جواب دیا، اُن میں مشہور محدث حافظ ابوحاتم محمد بن حبان (المتوفی ۳۵۴ھ) بھی ہیں۔ آپ نے اپنی صحیح میں یہ عنوان قائم کیا ہے۔ ''ذِكْرُ خَبَرٍ شُنِعَ بِهِ عَلٰى مُنْتَحِلِىْ سُنَنِ الْمُصْطَفٰى صلی اللہ علیہ وسلم مَنْ حُرِمَ التَّوْفِيْقَ لِاِدْرَاكِ مَعْنَاهُ ❷ ''یعنی اس حدیث کا ذکر جس کو ان لوگوں نے جو اس کے معنی کی حقیقت تک پہنچنے سے محروم ہیں، محدثین پر طعن کا ذریعہ بنالیا ہے۔

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسی لطمہ والی حدیث کو ذکر کر کے لکھتے ہیں۔

((اِنَّ اللّٰهَ جَلَّ وَعَلَا بَعَثَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم مُعَلِّمًا لِخَلْقِهِ، فَاَنْزَلَهُ مَوْضِعَ الْاِبَانَةِ عَنْ مُرَادِهِ فَبَلَّغَ صلی اللہ علیہ وسلم رِسَالَتَهُ وَبَيَّنَ عَنْ اٰيَاتِهِ بِاَلْفَاظٍ مُجْمَلَةٍ وَمُفَسَّرَةٍ عَقَلَهَا عَنْهُ اَصْحَابُهُ اَوْبَعْضُهُمْ وَهٰذَا الْخَبَرُ مِنَ

❶ بخاری' کتاب احادیث الانبیاء: باب وفاۃ موسی وذکرہ بعد ۳۴۰۷؛ مسند احمد' ۲/۲۶۹؛ مسلم' کتاب الفضائل :باب من فضائل موسیٰ ۶۱۴۸؛ ابن حبان' فی صحیحہ کتاب التاریخ' باب

الْاَخْبَارِ الَّتِیْ یُدْرِکُ مَعْنَاهُ مَنْ لَمْ یُحْرَمِ التَّوْفِیْقَ لِاِصَابَةِ الْحَقِّ، وَذَاکَ اَنَّ اللّٰهَ جَلَّ وَعَلَا اَرْسَلَ مَلَکَ الْمَوْتَ اِلٰی مُوْسٰی رِسَالَةَ اِبْتِلَاءٍ وَاخْتِبَارٍ وَاَمَرَهُ اَنْ یَّقُوْلَ لَهُ: اَجِبْ رَبَّکَ. اَمْرَ اخْتِبَارٍ وَابْتِلَاءٍ لَا اَمْرًا یُرِیْدُ اللّٰهُ جَلَّ وَعَلَا اِمْضَاءَهُ کَمَا اَمَرَ خَلِیْلَهُ صَلَّی اللّٰهُ عَلٰی نَبِیِّنَا وَعَلَیْهِ، بِذَبْحِ ابْنِهِ اَمْرَ اِخْتِبَارٍ وَابْتِلَاءٍ دُوْنَ الْاَمْرِ الَّذِیْ اَرَادَ اللّٰهُ جَلَّ وَعَلَا اِمْضَاءَهُ فَلَمَّا عَزَمَ عَلٰی ذَبْحِ اِبْنِهِ وَتَلَّهُ لِلْجَبِیْنِ، فَدَاهُ بِالذِّبْحِ الْعَظِیْمِ وَقَدْ بَعَثَ اللّٰهُ جَلَّ وَعَلَا الْمَلَائِکَةَ اِلٰی رُسُلِهِ فِیْ صُوَرٍ لَا یَعْرِفُوْنَهَا کَدُخُوْلِ الْمَلٰئِکَةِ عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ وَلَمْ یَعْرِفُهُمْ حَتّٰی اَوْجَسَ مِنْهُمْ خِیْفَةً وَکَمَجِیْءِ جِبْرِیْلَ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَسُؤَالُهُ اِیَّاهُ عَنِ الْاِیْمَانِ وَالْاِسْلَامِ فَلَمْ یَعْرِفْهُ الْمُصْطَفٰی ﷺ حَتّٰی وَلّٰی، فَکَانَ مَجِیْءُ مَلَکِ الْمَوْتِ اِلٰی مُوْسٰی عَلٰی غَیْرِ الصُّوْرَةِ الَّتِیْ کَانَ یَعْرِفُهُ مُوْسٰی عَلَیْهِ السَّلَامُ عَلَیْهَا وَکَانَ مُوْسٰی غَیُوْرًا فَرَاٰی فِیْ دَارِهِ رَجُلًا لَمْ یَعْرِفْهُ فَشَالَ یَدَهُ فَلَطَمَهُ، فَاَتَتْ لَطْمَتُهُ عَلٰی فَقْءِ عَیْنِهِ الَّتِیْ فِی الصُّوْرَةِ الَّتِیْ یَتَصَوَّرُ بِهَا لَا الصُّوْرَةُ الَّتِیْ خَلَقَهُ اللّٰهُ عَلَیْهَا وَلَمَّا کَانَ الْمُصَرَّحُ عَنْ نَبِیِّنَا صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْ خَبَرِ ابْنِ عَبَّاسٍ حَیْثُ قَالَ: اَمَّنِیْ جِبْرِیْلُ عِنْدَ الْبَیْتِ مَرَّتَیْنِ، فَذَکَرَ الْخَبَرَ وَقَالَ فِیْ اٰخِرِهِ هٰذَا وَقْتُکَ وَقْتُ الْاَنْبِیَاءِ قَبْلَکَ. کَانَ فِیْ هٰذَا الْخَبَرِ الْبَیَانُ الْوَاضِحُ اَنَّ بَعْضَ شَرَائِعِنَا قَدْ یَتَّفِقُ بَعْضَ شَرَائِعِ مَنْ قَبْلَنَا مِنَ الْاُمَمِ. وَلَمَّا کَانَ مِنْ شَرِیْعَتِنَا اَنَّ مَنْ فَقَاءَ عَیْنَ الدَّاخِلِ دَارَهُ بِغَیْرِ اِذْنِهِ اَوِالنَّاظِرِ فِیْ بَیْتِهِ بِغَیْرِ اَمْرِهِ مِنْ غَیْرِ جُنَاحٍ عَلٰی فَاعِلِهِ وَلَا حَرَجَ عَلٰی مُرْتَکِبِهِ لِلْاَخْبَارِ الْجَمَّةِ الْوَارِدَةِ فِیْهِ کَانَ جَائِزًا اِتِّفَاقُ هٰذِهِ الشَّرِیْعَةِ شَرِیْعَةَ مُوْسٰی بِاِسْقَاطِ الْحَرَجِ عَمَّنْ فَقَاءَ عَیْنَ الدَّاخِلِ دَارَهُ بِغَیْرِ اِذْنِهِ فَکَانَ اِسْتِعْمَالُ مُوْسٰی هٰذَا الْفِعْلَ مُبَاحًا لَهُ وَلَا

حَرَجَ عَلَيْهِ فِي فِعْلِهِ فَلَمَّا رَجَعَ مَلَکُ الْمَوْتِ اِلٰى رَبِّهِ وَاَخْبَرَهُ بِمَا كَانَ مِنْ مُوْسٰى فِيْهِ اَمَرَهُ ثَانِيًا بِاَمْرٍ اٰخَرَ اَمْرَ اِخْتِبَارٍ وَابْتِلَاءٍ. كَمَا ذَكَرْنَا قَبْلُ اِذْ قَالَ اللّٰهُ لَهُ: اِنْ شِئْتَ فَضَعْ يَدَکَ عَلٰى مَتْنِ ثَوْرٍ فَلَکَ بِكُلِّ مَا غَطَّتْ يَدُکَ لِكُلِّ شَعْرَةٍ سَنَةٌ فَلَمَّا عَلِمَ مُوْسٰى كَلِيْمُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلٰى نَبِيِّنَا وَعَلَيْهِ، اَنَّهُ مَلَکُ الْمَوْتِ، وَاَنَّهُ جَاءَهُ بِالرِّسَالَةِ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ، طَابَتْ نَفْسُهُ بِالْمَوْتِ وَلَمْ يَسْتَمْهِلْ، وَقَالَ فَالْاٰنَ فَلَوْ كَانَتِ الْمَرَّةُ الْاُوْلٰى عَرَفَهُ مُوْسٰى اَنَّهُ مَلَکُ الْمَوْتِ لَاسْتَعْمَلَ مَا اسْتَعْمَلَ فِي الْمَرَّةِ الْاُخْرٰى عِنْدَ تَيَقُّنِهِ وَعِلْمِهِ بِهِ.))

((ضِدُّ عِنْدَ قَوْلِ مَنْ زَعَمَ اَنَّ اَصْحَابَ الْحَدِيْثِ حَمَّالَةُ الْحَطَبِ وَرُعَاةُ اللَّيْلِ! يَجْمَعُوْنَ مَالَا يَنْتَفِعُوْنَ بِهِ وَيَرْوُوْنَ مَالَا يُوْجَرُوْنَ عَلَيْهِ! وَيَقُوْلُوْنَ بِمَا يُبْطِلُهُ الْاِسْلَامُ!! جَهْلًا مِنْهُ بِمَعَانِي الْاَخْبَارِ وَتَرْکِ التَّفَقُّهِ فِي الْاٰثَارِ مُعْتَمِدًا فِي ذَالِکَ عَلٰى رَاْيِهِ الْمَنْكُوْسِ وَقِيَاسِهِ الْمَعْكُوْسِ!!")) [1]

[تعلیق المسند الامام احمد: ص۲۲۔۶۷ ج۱۴ طبع مصر]

یعنی اللہ عزوجل نے رسول اللہ ﷺ کو اپنی مخلوق کی تعلیم اور اسے اپنے ارادہ سے آگاہ کرنے کے لیے مبعوث فرمایا۔ چنانچہ آپ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچایا اور اس کی آیات کی کبھی بالاختصار اور کبھی بالتفصیل ایسی وضاحت فرمائی جسے تمام یا بعض صاحب فہم وذکا صحابہ نے سمجھ لیا۔ یہ حدیث بھی منجملہ ان احادیث کے ہے جن کا معنیٰ ہر وہ شخص سمجھ سکتا ہے جو معرفتِ حق کی توفیق سے محروم نہیں ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے پاس بطور آزمائش ملک الموت کو یہ کہہ کر بھیجا کہ موسیٰ سے کہو "موت کے لیے تیار ہو جائے" مگر اللہ تعالیٰ کا یہ حکم نافذ کرنے کے لیے نہیں بلکہ محض آزمائش اور امتحان کے لیے تھا۔ ایسا ہی ایک آزمائشی حکم اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کو بھی دیا تھا کہ وہ اپنے جان

[1] صحیح ابن حبان، کتاب التاریخ، باب بدء الخلق ذکر خبر شنع به علی منتحلی سنن المصطفیٰ من حرم التوفیق لادارک معناه، ۱۴/۱۱۴۔

سے بھی زیادہ عزیز بیٹے کو ذبح کر دیں وہ حکم نافذ کرنے کے لیے نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کے لیے منہ کے بل زمین پر گرایا تو خداوند کریم نے ان کی بجائے ایک دنبہ بھیج دیا۔ علاوہ ازیں بعض اوقات اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو انبیا علیہم السلام کے پاس ایسی صورت میں بھیجا جسے وہ نہیں پہچانتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس فرشتے مہمان انسانوں کی شکل میں آئے اور ان کے کھانا نہ کھانے سے حضرت خلیل الرحمٰن علیہ السلام خوف زدہ بھی ہوئے۔ اسی طرح ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جبریل علیہ السلام مسافر آدمی کی صورت میں حاضر ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان، اسلام اور احسان کے متعلق سوالات کیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چلے جانے کے بعد انہیں پہچانا۔ اسی طرح ملک الموت موسیٰ علیہ السلام کے پاس غیر معروف شکل میں آئے۔ موسیٰ علیہ السلام ایک اجنبی آدمی کو یوں بلا اجازت اندر آتے دیکھ کر برداشت نہ کر سکے اور غیرتِ طبعی سے متاثر ہو کر اُس کے منہ پر طمانچہ دے مارا جس سے اس کی آنکھ پھوٹ گئی جو اس کی حقیقی آنکھ نہ تھی بلکہ ظاہری صورت میں عارضی آنکھ تھی۔

امامتِ جبریل علیہ السلام کی حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تصریح فرمائی ہے کہ نماز سے فراغت کے بعد جبریل علیہ السلام نے کہا:

(هٰذَا وَقْتُکَ وَوَقْتُ الْاَنْبِيَاءِ قَبْلَکَ) [1]

"آپ کے علاوہ آپ سے پیشتر انبیا کی نماز کے اوقات بھی یہی تھے۔"

اس حدیث سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ اس شریعت کے بعض احکام پہلی شریعتوں کے بعض احکام سے موافق ہیں جیسے ہماری شریعت میں بلا اجازت گھر میں داخل ہونے یا بلا اذن مکان میں جھانکنے والے کی آنکھ پھوڑنے پر کوئی گناہ اور مواخذہ نہیں۔ بہت ممکن ہے موسیٰ کی شریعت میں بھی بلا اجازت گھر میں داخل ہونے والے کی آنکھ پھوڑنا جائز ہو اور اس بارہ میں صاحب مکان پر کوئی گناہ اور ملامت نہ ہو، اور موسیٰ علیہ السلام نے اس شرعی حکم کی تعمیل میں یہ فعل کیا ہو۔ پھر جب فرشتے نے ان کے اس سلوک کی اللہ تعالیٰ کے پاس جا کر شکایت کی تو

---

[1] بخاری، کتاب المواقیت باب مواقیت الصلاۃ ۵۲۱؛ مسلم، کتاب المساجد باب اوقات الصلوات الخمس ۱۳۷۹؛ ابوداؤد، کتاب الصلاۃ باب فی المواقیت ۳۹۳؛ الترمذی، کتاب الصلاۃ، باب ما جاء فی المواقیت ۱۴۹؛ ابن ماجه، کتاب الصلاۃ باب مواقیت الصلاۃ، ۶۶۷۔

دربارِ الٰہی سے اسے ایک دوسرا آزمائشی حکم دے کر بھیجا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام سے کہو "اگر آپ مرنا نہیں چاہتے تو بیل کی پیٹھ پر ہاتھ رکھیئے، جتنے بال ہاتھ کے نیچے آئیں، ہر بال کے عوض آپ کی عمر میں ایک سال کا اضافہ ہو جائے گا۔ اب کلیم اللہ کو معلوم ہوا کہ یہ ملک الموت ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغامِ موت لے کر حاضر ہوا ہے چنانچہ اب آپ برضا ورغبت مرنے کے لیے تیار ہو گئے اور فرمایا: "میں ابھی واصل بحق ہونا چاہتا ہوں۔"

مذکورہ بالا بیان سے معلوم ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام پہلی دفعہ ملک الموت کو نہیں پہچان سکے۔ اگر انہیں معلوم ہو جاتا کہ یہ ملک الموت ہے تو یقیناً ان کے ساتھ وہی سلوک کرتے جو دوسری مرتبہ کیا۔

یہ ہے اس حدیث پاک کا مطلب جسے اپنی الٹی سمجھ اور معکوس قیاس پر اعتماد کرنے کی وجہ سے احادیث اور آثارِ نبویہ (علیٰ صاحبها الف الف تحية) کو سمجھنے کی توفیق سے محروم شخص نہ سمجھ سکا اور الٹا محدثین کرام پر رطب ویابس جمع کرنے اور رات کی تاریکی میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کا الزام لگا دیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے متعلق یہ حدیث معتزلہ کی طرح ہمارے مولانا کو بھی "عقل عام" کے خلاف معلوم ہوئی، حالانکہ بقول حافظ ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ وہ ایک ابتلا تھا جسے یوں ہی ختم ہونا تھا۔

ظاہر ہے کہ موت کا وقت کم وبیش نہیں ہوتا ﴿اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝﴾ [1] ملک الموت آئے اور تھپڑ کھا کر چلے گئے پھر اللہ کے پاس شکایت کی اور اتنی دیر موسیٰ علیہ السلام زندگی کی بہاریں گزارتے رہے۔ اس حدیث سے یہ مفہوم اخذ کرنا صحیح نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ملک الموت قبل از وقت آزمائش کے لیے انسانی شکل میں آئے تھے اور اُنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے ایک مطالبہ اس وضع میں رکھا جس کا ان کو حق نہ تھا، اس کی پاداش ملی، یہی قدرت کا منشا تھا۔ انبیا علیہم السلام کی زندگی میں ایسے مراحل آتے ہیں جو عقلِ عام کی رسائی سے بالا ہوتے ہیں۔ جو شخص ان کو عقل عام کے پیمانوں سے ناپنا شروع کر دے گا وہ ناکام ہوگا۔ اس کی تسکین اسی صورت میں ہوگی کہ وہ متعلقہ واقعہ کا انکار کرے اور عقل کے لیے تسکین کا بے حقیقت سامان پیدا کرے۔ انبیا کے معجزات اور ملاء

---

[1] ۱۰/یونس: ۴۹۔

اعلیٰ کے ساتھ ان کے تعلقات یہ عقلِ عام کا مسئلہ نہیں، یہاں خواص کی عقلیں بھی حیران رہ جاتی ہیں لہٰذا اگر طبیعت مطمئن ہو سکے تو شارع کے الفاظ میں ہی اسے قبول فرمایئے ورنہ جو جی میں آئے فیصلہ کیجئے، اسے اگر عقل کی سان پر چڑھایا گیا تو سان ٹوٹے گی یہ واقعات قائم رہیں گے۔

مؤدبانہ گزارش

مولانا کے ارشادات کا جب یہ مقام سامنے آیا جس میں تین احادیث پر شبہ فرمایا گیا ہے تو مجھے بیحد دُکھ ہوا اور مولانا کے ان ارشادات کے متعلق جب کچھ لکھنے کی کوشش کی تو طبیعت رنج اور افسوس کے جذبات سے لبریز ہوگئی اس لیے قلم رکھ دیا، میں نہیں چاہتا تھا کہ مولانا کے احترام کیخلاف نوک قلم سے کوئی فقرہ نکل جائے، آج مدت کے بعد قلم اٹھایا۔ سنتِ نبوی ﷺ کے متعلق جذبات میں آج بھی دکھ اور قلق موجود ہے۔ افسوس ہے کہ اتنی پوزیشن کے لوگ کس بے پروائی سے سنت کے متعلق جو منہ میں آئے کہہ جاتے ہیں۔ اس وقت اگر کوئی ناخوشگوار لفظ قلم سے نکلا تو صمیم قلب سے اس کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔ مقصد طعن و تشنیع نہیں۔ اس دورِ فتن میں سنت اور علوم نبویہ کے خلاف ایسے الفاظ فی الواقع ناگوار ہیں۔ مولانا پر طنز قطعاً مقصود نہیں۔ سنت کے سات محبت اور قلب کا سنتِ رسول سے ربط ان پریشان خیالات کے اظہار کا موجب ہوا۔

گفتگوئے عاشقاں درباب رب
جذبۂ عشق است نے ترکِ ادب

مولانا کے ارشادات کے بعض حصص اور مودودی صاحب کا ''مسلک اعتدال'' قطعاً اس قابل نہیں کہ ان کی اشاعت کی جائے، ان میں جو کچھ صحیح ہے وہ بھی غلط انداز سے کہا گیا ہے اور مسلکِ اعتدال میں تو دماغ کے کباڑ خانہ نے خیالات اس بے اعتدالی سے اُگل دیئے ہیں کہ اگر کوئی منکرِ حدیث بھی لکھتا تو یہی کچھ لکھتا۔

ائمہ حدیث کے مناقشات

مولانا نے محدثین کے باہمی مناقشات کو اہل قرآن سے بھی زیادہ نمایاں فرمایا ہے اور اس انداز سے فرمایا ہے کہ شاید مولانا ملت کو کوئی عجیب اور نئی چیز عنایت فرما رہے ہیں۔ مولانا

غور فرمائیں یہ انسانی مزاج کی ایک کمزوری ہے، فن رجال کو چھوڑیئے کوئی فن اس سے خالی نہیں۔ شعر و سخن، ادب، نحو اور قواعد، معانی، بیانِ فقہ اور اصولِ فقہ کس فن میں یہ مناقشات نہیں؟ بقولِ جناب ائمہ تفسیر میں بھی یہ کمزوری موجود ہے اور آپ کی جماعت اور علما کے مناقشات بھی اس کی ایک کڑی ہیں تو کیا اس بنا پر آپ اور تمام علما کے افادات سے دست بردار ہو جانا چاہیے؟ جب سے علم رجال وضع ہوا ہے اس قسم کا ذخیرہ موجود ہے اور اس کے باوجود اس میں حق و باطل کا امتیاز غیر مشتبہ طور پر کیا جا سکتا ہے اور کیا گیا ہے۔ پھر اس بے ضرورت مواد کو حدیث کے دفاع کے موقع پر ذکر کرنے کی کیوں ضرورت محسوس ہوئی؟ جہاں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ کہنے کا موقع تھا وہی آپ نے شرم سے نظر نیچی فرمالی، جہاں تن کر چلنے کا موقع تھا آپ سر بسجود ہو گئے۔ عبداللہ چکڑالوی، خواجہ احمد دین امرتسری، مستری رمضان گوجرانوالہ، محبوب شاہ گوجرانوالہ، سید عمر شاہ گجرات، شیخ عطاء اللہ وکیل، مفتی محمد دین وکیل گجرات، ملتان کے منکرین حدیث، ڈیرہ غازی خان کے اہل قرآن اور ادارۂ طلوع اسلام کے اربابِ قیادت، اور ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے ملحدین کے نظریات میں بعد المشرقین اور ان کا باہمی برسوں کا جوت پیزار کسے معلوم نہیں لیکن کبھی اُنہوں نے آپ کے سامنے اس کا تذکرہ کیا؟ نماز، زکوٰۃ، حج کے متعلق جو پراگندہ خیالی اور اس کے متعلق جو بدعملی ان اساطین الحاد و فسق میں موجود ہے اس کا کبھی انہوں نے اعتراف کیا؟ پھر مولانا مودودی کو کیا مصیبت ہے کہ امام ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی شکر رنجی کا بلا ضرورت تذکرہ چھیڑ دیں۔ علمائے عراق اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے بعض مخالفانہ آراء و افکار کا اشتہار دیں، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور اعمش کی چشمک کا نوحہ فرمائیں۔ اس سے اصل فن اور اس کی خوبیوں پر آخر کیا اثر پڑتا ہے اور ان مقدسین میں جن کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے، اگر سو پچاس میں کسی وقت (بشرطِ صحت سند) کوئی شکر رنجی یا مناقشہ ہوا بھی ہو تو پورے فن پر اس کا کہاں تک اثر پڑ سکتا ہے؟ میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ اوّل تو آپ حضرات سنت کے دفاع کی ذمہ داری لیتے ہی کیوں ہیں؟ آپ کے ہاں مولوی عبدالغفار حسن صاحب ایسے دو ایک حضرات اور بھی موجود ہیں جو غالباً آپ کی جماعت کے مزاج اور اس کے نظم کے احترام کی وجہ سے خاموش ہو جاتے ہیں، انہیں اجازت مرحمت فرمائیں، وہ اس موضوع پر لکھیں اور اپنے ضمیر کی آواز کے

مطابق لکھیں۔ جماعت کے اجتماعی مزاج سے انہیں مستثنیٰ فرمایا جائے۔ میرا خیال ہے وہ یہ فریضہ بہتر طور پر ادا کر سکتے ہیں۔ یہ فرض کفایہ اچھا ہے اُن پر ڈال دیا جائے۔

آحاد کے متعلق اختلاف اور خرابی کا پہلا دور

یُوں تو زمانہ نبوت ہی میں ایسا عنصر موجود تھا جو آنحضرت ﷺ کی تفصیلی ہدایات، تربیت اور آپ کے احتساب سے گھبراتا تھا، کبھی غنائم کی تقسیم کے سلسلہ میں ذہن نمایاں ہوتا، اِنَّ هٰذَا قِسْمَةٌ لَمْ يُرِدْبِهِ وَجْهَ اللّٰهِ (احمد) [1] کبھی آنحضرت ﷺ کی طرف غلول کی نسبت کرتے، مختلف طور پر وہ آنحضرت ﷺ سے تنفّر پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ ﴿رَأَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا﴾ [2] منافق آپ کی خدمت میں آنے سے گھبراتے اور بدکتے ہیں لیکن دانش منداور سلجھی ہوئی طبائع کی موجودگی میں اس ذہن کو ابھرنے کی توفیق نہ مل سکی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں ان لوگوں کو کچھ کھل کر کہنے اور اجتماعی طور پر شرارت کرنے کا موقعہ ملا، اس کی تفصیل احادیث اور ادب کی کتابوں میں ملتی ہے۔

اس ذہن کی تنظیم

لیکن دوسری صدی میں معتزلہ کی وجہ سے اس ذہن نے ایک باقاعدہ اور اصولی شکل اختیار کر لی۔ مگر خوارج اور یہ حضرات کھل کر حدیث کا انکار نہ کر سکے۔ فضائل اہل بیت کا انکار خوارج نے کیا اور احادیثِ صفات کا انکار حضرات معتزلہ نے کیا اور احادیث مناقب کا انکار شیعہ نے کیا۔ اس کے علاوہ یہ حضرات احادیث کا پورا پورا احترام کرتے تھے۔ معتزلہ فروع میں شیعہ ہیں، بعض حنفی اور شافعی۔ وہ اپنے اپنے اماموں کی طرح فروع میں احادیث سے استدلال کرتے ہیں۔ اسی طرح خوارج میں آج بھی حدیث پڑھی پڑھائی جاتی ہے۔ الجامع الصحیح کے نام سے حکومتِ مسقط کی طرف سے حدیث کی ایک کتاب خوارج میں موجود ہے جسے وہ بڑی عقیدت سے پڑھتے ہے۔ خوارج کے اس جزوی انکار کا تذکرہ سنت کی کتابوں میں بھی ملتا ہے۔ اعتزال کی سرپرستی عباسی حکومت نے کی۔ اس فتنہ نے قریباً دوسری صدی میں سر

---

[1] مسند احمد، ٤/٤٢٢-٤٢٣؛ مسند الطيالسي، ٢/٢٣٧ رقم ٩٦٥؛ مجمع الزوائد، ٦/٢٢٩؛ كنز العمال، ١١/١٩٨۔ [2] ٤/النساء: ٦١۔

اٹھایا۔اس لیے انکارحدیث کے متعلق یہ جوردروازہ قریباً دوسری صدی میں کھلا۔ان کا زیادہ زور اُن احادیث پرتھا جو صفاتِ باری تعالیٰ کے متعلق ان کے مزعومات کے خلاف تھیں اور حدیث کے متعلق اُن کے ذوق کی ''سلامتی'' کا یہ حال ہے کہ وہ متواتر احادیث کو بھی آحاد کہہ کرٹال دیتے ہیں۔نصوص قرآنیہ کی تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ بھی اسے سُن پائیں تو انہیں حیرت ہو۔

ولے تاویل شاں درحیرت انداخت
خدا و جبرئیل و مصطفی را

آحاد پر اشتباہ دوسری صدی کے شروع میں

یہ لوگ قرون خیر میں تو موجود نہ تھے،ان کی نشاندہی وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کو ان سے سابقہ پڑا۔ابن حزم فرماتے ہیں:

(وَاَیْضًا فَاِنَّ جَمِیْعَ اَهْلِ الْاِسْلَامِ کَانُوْا عَلٰی قَبُوْلِ خَبَرِ الْوَاحِدِ الثِّقَةِ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ یَجْرِی عَلٰی ذَالِکَ کُلُّ فِرْقَةٍ فِی عِلْمِهَا کَاَهْلِ السُّنَّةِ وَالْخَوَارِجِ وَالشِّیْعَةِ وَالْقَدَرِیَّةِ حَتّٰی حَدَثَ مُتَکَلِّمُوْا الْمُعْتَزِلَةِ بَعْدَ الْمِاَةِ مِنَ التَّارِیْخِ فَخَالَفُوا الْاِجْمَاعَ فِی ذَالِکَ) 1

''تمام مسلمان اگر راوی ثقہ ہوتو خبرِ واحد کو قبول کرتے تھے،اہل سنت،خارجی،شیعہ، قدریہ کا یہی خیال تھا۔ہاں پہلی صدی کے بعد معتزلہ متکلمین کی جماعت پیدا ہوئی اور انہوں نے اس اجماع امت کی مخالفت کی۔''

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور اسحاق بن راہویہ خبر واحد صحیح سے جو کچھ ثابت ہو اس سے انکار کو کفر سمجھتے تھے۔ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ ایک مقام پر ان لوگوں پر اس طرح سے تعجب فرماتے ہیں: ''یہ لوگ آنحضرت ﷺ کی احادیث کو اس لیے نہیں مانتے کہ (وہ آحاد ہیں) ان سے علم حاصل نہیں ہوتا، اور ذہنی خیالات اور باطل شبہات کو قبول کر لیتے ہیں۔جو معتزلہ،جہمیہ اور فلاسفہ سے منقول ہیں اوران کا نام براہین عقلیہ رکھ لیتے ہیں 2

1 الاحکام' لا بن حزم فصل فیہ اقسام الاخبار عن اللہ: ۱/ ۱۱۰۔

2 الصواعق المرسلہ' القسم الثانی من الاخبار ۲/ ۳۷۵۔

ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے صواعق مرسلہ کی دوسری جلد کے قریباً ایک سو سے زائد صفحات معتزلہ کے اسی نظریہ کے خلاف لکھے ہیں جو انہوں نے خبر واحد کے متعلق ظاہر کیا اور اسی نظریہ کے سہارے پر سینکڑوں سنن صحیحہ کا انکار کیا۔ حق کی جستجو کرنے والوں کو اس طرف توجہ کرنی چاہیے۔ حدیث کے متعلق تحقیقی مطالعہ کے لیے موافقات کا باب السنۃ، احکام ابن حزم کا باب السنۃ اور صواعق مرسلہ کا یہ مقام ضرور دیکھنا چاہیے۔

دوسرا دور

دوسرا دور معتزلہ کے اس حملہ سے صرف اہل حدیث اور حنابلہ محفوظ تھے۔ احناف، موالک، شوافع اور شیعہ سے بعض اہل علم اعتزال سے متاثر ہو گئے تھے۔ وہ فروع میں احادیث کو مانتے، احاد کی ظنیت پر یقین کرتے تھے۔ احناف میں سے بشر مریسی (متوفی ۲۲۸ھ) تو کھلے معتزلی ہیں۔ [1] قاضی عیسیٰ بن ابان [2] (متوفی ۲۲۱ھ) امام محمد کے شاگرد ہیں۔ مولانا عبدالحئیؒ نے فوائد البہیہ میں ان کا مختصر ترجمہ لکھا ہے، ابن ندیم نے فہرست میں لکھا

---

[1] تاریخ بغداد' ۷/۵۶-۶۷ وقال ان المتوفی ۲۱۸ یا ۲۱۹۔

[2] قاضی عیسیٰ بن ابان کا مسلک متقدمین ائمہ احناف میں مقبول نہ تھا جیسے اصول بزدوی اور اس کی شرح سے ظاہر ہے: ① متاخرین احناف بھی اسے اپنا نظریہ سمجھ کر اس سے استفادہ کرتے رہے اور مصراۃ وغیرہ کی روایات کو رد کرتے رہے۔ آجکل بعض نو آموز اور کم سواد حضرات اس غلط اور منحوس نظریہ کو حضرت امام سیدنا ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اس نظریہ کی کچھ آبرو رہ جائے یہ روایت ابو مطیع بلخی سے مروی ہے۔ روایت بالکل من گھڑت اور وضعی ہے اس کی نسبت حضرت امام کی طرف بالکل جھوٹ ہے۔ ابو مطیع بلخی ائمہ نقد کے نزدیک نا قابل اعتماد ہیں۔ ذہبی فرماتے ہیں: وہ آثار کے ضبط میں واہی ہیں: ② ابن معین نے فرمایا وہ راشی ہیں۔ ③ نسائی نے اُنہیں ضعیف کہا۔ احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ان سے روایت درست نہیں۔ ④ ابوداؤد نے کہا یہ متروک الروایہ اور جہمی ہیں۔ ⑤ ابن عدی نے کہا: ان کا ضعف ظاہر ہے۔ ⑥ ابن حبان نے فرمایا یہ مرجئہ کا سردار ہے، اسے سنت سے بغض ہے اور اس میں غلط بیانی کرتے ہیں۔ ⑦ ان کا انتقال ۱۹۵ھ میں ہوا۔ میزان الاعتدال، ایضاً تاریخ خطیب، تاریخ ابن معین ۲/۱۲۴ (رقم ۴۷۶۰) یہ نسبت قطعاً غلط وضعی اور مختلق ہے۔ آج کل کے بعض نو خیز طلبۃ العلم نے اسے نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس اثر کے متعلق باقی مباحث کسی دوسرے وقت مذکور ہوں گے۔ سردست اس قدر اظہار مقصود ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف اس جہمی نظریہ کی نسبت غلط ہے۔

---

① میزان الاعتدال' ۵۷۴۱ رقم ۲۱۸۱۔ ② کشف الاسرار' فصل فی تقسیم الراوی ۲/۱۴۔

③ میزان الاعتدال' ۱/۵۷۴ رقم ۲۱۸۱۔ ④ تاریخ ابن معین' ۲/۱۲۴ رقم ۴۷۶۰۔

⑤ الکامل فی ضعفاء الرجال' ۲/۶۳۱۔

⑥ میزان الاعتدال' ۱/۵۷۴، ترجمۃ الحکم بن عبداللہ ابو مطیع البلخی۔

ہے کہ ان کا تعلق سپاہی خاندان سے تھا۔ 1 پھر علمی شغل اختیار فرمایا: خطیب نے صراحت کی ہے کہ وہ خلقِ قرآن کے قائل تھے۔ 2

مصنف کتاب التحقیق شرح حسامی نے ان کا تذکرہ ان الفاظ میں فرمایا ہے: ''قَالَ عِيْسَى بْنُ اَبَانَ وَعَبْدُ الْجَبَّارِ مِنَ الْمُعْتَزِلَةِ 3 ان قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ قاضی عیسیٰ بن ابان کا رجحان بھی اعتزال کی طرف تھا۔ ان کی وجہ سے فروع میں بھی اخبارِ آحاد کو اشتباہ کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ چنانچہ عادل وضابط راوی اگر فقیہ نہ ہو تو اس کی روایت مقبول نہیں ہو گی بلکہ قیاس کو اس کی روایت پر ترجیح دی جائے گی۔ وَاَمَّا رِوَايَةُ مَنْ لَمْ يُعْرَفْ بِالْفِقْهِ وَلٰكِنَّهُ مَعْرُوْفٌ بِالْعَدَالَةِ وَالضَّبْطِ مِثْلُ اَبِيْ هُرَيْرَةَ وَاَنَسِ بْنِ مَالِكٍ فَاِنْ وَافَقَ الْقِيَاسَ عُمِلَ بِهٖ وَاِنْ خَالَفَهُ لَمْ يُتْرَكْ اِلَّا بِالضَّرُوْرَةِ. 4 ''عادل اور ضابط راوی اگر فقیہ نہ ہو جیسے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور انس بن مالک رضی اللہ عنہ تو ان کی روایت اگر قیاس کے موافق ہو تو قبول کی جائے ورنہ اسے ضرورۃً ترک کر دیا جائے گا۔''

قاضی عبدالعزیز بن احمد شارح اصول بزودی فرماتے ہیں ''حدیث کو قیاس پر مقدم کرنے کے لیے ہم نے جو فقہ راوی کی شرط لگائی، یہ صرف عیسیٰ بن ابان کا مذہب ہے اور قاضی ابوزید دبوسی نے اسے پسند کیا اور مصراۃ...... اور عرایا کی حدیث کو اسی اصول پر تخریج کیا ہے اور بہت سے متاخرین نے اسے اپنا لیا امام ابوالحسن کرخی اور باقی قدماءِ احناف اس کے خلاف ہیں۔ وہ فرماتے ہیں: عادل اور ضابط راوی کی حدیث بہر حال قیاس پر مقدم ہوگی اور اکثر علما کا یہی خیال ہے۔ خود حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ضعیف حدیث کو قیاس پر ترجیح دیتے ہیں۔ 5 یہ قاعدہ اصولِ فقہ کی قریباً تمام کتابوں میں مرقوم ہے اور قدماءِ احناف نے بھی اسے پسند نہیں فرمایا کہ ضعیف حدیث پر قیاس کو ترجیح دی جائے۔ ویسے بھی یہ قول غلط ہے، قاضی عیسیٰ بن ابان ایسے بزرگ، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ جیسے بزرگوں کو جو

---

1 الفہرست لا بن ندیم' ص ۳۰۳۔ 2 تاریخ بغداد' ۱۱/۱۵۹۔

3 کتاب التحقیق' بشرح الحسامی ص۱۷۵۔ 4 اصول البزدوی' باب نقسم الراوی الذی جعل خبرہ حجۃ :ص ۱۵۹؛ الاحکام' فی اصول الاحکام للآمدی:المسالہ التاسعۃ ۲/۱۶۹۔

5 کشف الاسرار' علی المنار فصل فی تقسیم الراوی: ۲/۱۴۔

برسوں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں رہے، جن کی مادری زبان عربی ہے، غیر فقیہ کہہ دیں تو بڑی عجیب بات ہے۔ حالانکہ وہ خود نہ عرب ہیں نہ علمی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا تفقہ معلوم ہے۔ اکابر صحابہ مسائل میں ان کی طرف رجوع فرماتے ہیں۔ گورنرتک کے عہدوں پر فائز رہے۔ خود ائمۂ احناف نے ان کی احادیث کو خلافِ قیاس قبول فرمایا۔ کشف الاسرار [1] کتاب التحقیق وغیرہ مبسوطات میں اس کی تفصیل مل سکتی ہے۔

اس کے باوجود متاخرین احناف میں انکار کے لیے جزوی طور پر یہ چور دروازہ کھولا گیا۔ ترک کرنے کے لیے ایک راہ پیدا ہوئی، لیکن اس میں اس قدر احتیاط رکھی گئی کہ وہی احادیث متروک ہوں گی جن کے راوی فقیہ نہ ہوں گے (یہاں فقہ سے مراد یہ ہے کہ وہ راوی عربی زبان کو اچھی طرح جانتا ہوتا کہ روایت بالمعنیٰ میں غلطی نہ کرے) فقیہ رُواۃ کی روایات رائے کے موافق ہوں یا مخالف، قاضی عیسیٰ بن ابان اوران کے اتباع اسے قبول کرتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ رائے کا دروازہ بند نہیں ہونا چاہیے۔ کہیں نہ کہیں اس کے لیے گنجائش نکلنی چاہیے۔ اس احتیاط کے باوجود ان کا یہ مذہب قدما احناف میں قبولیت حاصل نہ کر سکا۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ، امام محمد اور حضرت امام کے مشہور تلامذہ کو قاضی عیسیٰ بن ابان سے ان کی اس احتیاط کے باوجود اختلاف ہے۔ صحیح راہ وہی ہے جسے جمہور ائمۂ سنت نے اختیار فرمایا۔ قاضی عیسیٰ بن ابان کے مسلک میں سے اعتزال کی بو آتی ہے، اور ائمہ حدیث کا نقطۂ نظر تو قدما اور اکابرِ احناف سے بھی مختلف ہے۔

تیسرا دور

متاخرین احناف میں قاضی عیسیٰ بن ابان کے مسلک پر عمل ہونے لگا۔ فقہ اور اصول فقہ میں اسی کی بنیاد پر فروع اور اصول تخریج کیے گئے۔ بعض جگہ صریح احادیث کی بھی بعید از کار تاویلات کی گئیں۔ عینی شرح کنز میں نکاح حلالہ کے افادہ تحلیل کا ذکر فرما کر حدیث ((لَعَنَ اللّٰهُ الْـمُـحَلِّلَ وَالْمُحَلَّلَ لَهُ)) کی تاویل اس طرح فرمائی گئی لَـعَـلَّهُ اَرَادَ بِاللَّعنَةِ الرَّحْمَةِ (عینی بر حاشیہ کنز کشوری) یعنی حدیث میں لعنت سے شائد رحمت مراد ہو۔ غرض متاخرین کی تصانیف میں

[1] کشف الاسرار' فصل فی تقسیم الراوی: ۲/۱۷۔

اعتزال کو کافی دخل ہو گیا۔ اصولِ فقہ میں سب سے پہلی تصنیف امام شافعی نے کی۔ اَوَّلُ مَنْ صَنَّفَ فِيْهِ اَلْاِمَامُ الشَّافِعِي 1 اس کے بعد جب اصولِ فقہ فن کی صورت میں مدون کیا گیا تو اس میں اہل حدیث اور معتزلہ نے بہت کچھ لکھا۔ وَاَكْثَرُ التَّصَانِيْفِ فِيْ اُصُوْلِ الْفِقْهِ لِاَهْلِ الْاِعْتِزَالِ اَلْمُخَالِفِيْنَ لَنَا فِي الْاُصُوْلِ وَلِاَهْلِ الْحَدِيْثِ اَلْمُخَالِفِيْنَ لَنَا فِي الْفُرُوْعِ 2 ''اصولِ فقہ میں معتزلہ نے زیادہ کام کیا، وہ اصول اور عقائد میں ہمارے مخالف ہیں، یا پھر اہل حدیث نے تصانیف کیں، وہ فروع میں ہم سے مختلف ہیں۔''

معتزلہ کا اثر عقائد میں تو تھا ہی، فقہیات بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکے بَعْضُهُمْ يَزْعَمُ اَنَّ بِنَاءَ الْمَذْهَبِ عَلٰى هٰذِهِ الْمُحَاوَرَاتِ الْجَدَلِيَّةِ الْمَذْكُوْرَةِ فِيْ مَبْسُوْطِ السَّرْخَسِيْ وَالْهِدَايَةِ وَالتَّبْيِيْنِ وَنَحْوِ ذَالِكَ وَلَا اَنَّ اَوَّلَ مَنْ اَظْهَرَ ذَالِكَ فِيْهِمْ اَلْمُعْتَزِلَةُ وَلَيْسَ عَلَيْهِ بِنَآءُ مَذْهَبِهِمْ 3

''بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہدایہ' تبیین' مبسوط سرخسی میں جو جدلی مباحثات پائے جاتے ہیں حنفی مذہب کی بنا ان پر ہے' انہیں معلوم نہیں کہ یہ معتزلہ کی مہربانی ہیں حنفی مذہب ان پر مبنی نہیں۔''

غرض دوسرے دور میں فروع اس سے متاثر ہوئے اور عقائد کے بعد اعمال پر اس کا اثر پڑا۔

فقہ راوی

دوسرے مقام پر شاہ صاحب نے فرمایا: ''محققین کی یہ پختہ رائے ہے کہ عدل اور ضبط کے بعد راوی کے لیے فقہ کی شرط یہ صرف عیسیٰ بن ابان کا مذہب ہے اور بہت سے متاخرین بھی اس میں ان کے ساتھ ہیں، امام کرخی اس کے خلاف ہیں اور قدمائے احناف سے بھی یہ مذہب منقول نہیں۔ ان کی رائے ہے کہ حدیث بہرحال مقدم ہے۔'' 4

غرض رائے اور قیاس کی دھاندلی متاخرین میں ہے۔ یہ قدما میں نہ تھی قدما کی اس احتیاط کے باوجود ائمہ حدیث نہ متقدمین کی روش پر مطمئن تھے۔ نہ متاخرین کے طریق پر، یہ

---

1 كشف الظنون' عن اسامی الكتب والفنون علم اصول الدين علم اصول الفقه' ۱/۱۱۱۔

2 كشف الظنون علم اصول الفقه' ۱/ ۱۱۰؛ ابجدالعلوم' علم اصول الفقه' ۲/ ۷۱۔

3 حجة الله البالغة' باب حكاية حال الناس قبل المائة الرابعه و بعدها' ۱/ ۱۶۰۔

4 حجة الله البالغة' باب حكاية حال الناس قبل المائة الرابعة و بعدها' ۱/ ۱۶۱

حضرات دونوں جگہ حدیث اور سنت کے صافی چشموں کو مکدر پاتے تھے شعبی فرماتے ہیں: لَقَدْ بَغَّضَ اِلَیَّ هٰؤُلَاءِ الْاَرَائِیُوْنَ الْمَسْجِدَ حَتّٰی اَنَّهُ لَاَبْغَضُ اِلَیَّ مِنْ کُنَاسَتِهِ دَارِیْ قَالُوْا مَنْ هُمْ قَالَ اَلْحَکَمُ وَحَمَّادٌ وَحَمَّادٌ اَصْحَابَهُ۔ [1]

جو لوگ اُس وقت اس محتاط روش پر مطمئن نہیں وہ آج کل نیچر پرستی پر کیسے مطمئن ہو سکتے ہیں۔ آج کے اہلِ حدیث حضرات سب کچھ دیکھتے ہیں اور ان کی سلفیت پر کوئی آنچ نہیں آتی۔

اَکُلُّ امْرِءٍ تَحْسَبِیْنِیْ اِمْرَاءً
وَنَارٌ تُوْقَدُ بِاللَّیْلِ نَارًا

ہمیں یقیناً معلوم ہے کہ ائمہ اربعہ حدیث کو حجت مانتے ہیں، اسے دین کا ماخذ سمجھتے ہیں اور اسی تعریف سے حجت سمجھتے ہیں جو ائمہ سنت اور عامتہ المسلمین میں مسلم ہے اور ایک دوسرے کو مسلمان سمجھنے کے باوجود اہل حدیث کو احناف، شوافع، موالک اور حنابلہ کی فقہیات سے اختلاف ہے، وہ ان سکول ہائے فکر میں حدیث اور سنت کی تقدیس کو اس قدر محترم اور محفوظ نہیں سمجھتے جس قدر اہل حدیث اور سلفی سکولِ فکر میں اسے محترم اور محفوظ پاتے ہیں۔

چوتھا دور

انگریز کی آمد کے بعد جب ملک میں تعلیمی نظام تقسیم ہوا، دینی تعلیم حضری تعلیم سے الگ ہو گئی۔ سکولوں اور کالجوں کا طریقِ فکر مذہبی مدارس سے مختلف ہو گیا۔ عیسائی مبلغ اپنی حکومت کی سرپرستی میں ہندوستان میں چھا گئے علما اور مذہبی مدارس تو ان سے کیا متاثر ہوتے، انگیزی تعلیم اور ان کی حمایت کرنے والے ان سے بہت حد تک متاثر ہوئے۔ سید احمد خاں مرحوم سے لے کر سکولوں کے طلبہ اور اساتذہ تک اس کے اثر سے نہ بچ سکے، ان میں سے بعض حضرات کی اسلام سے وابستگی واقعی خلوص پر مبنی تھی اور ان لوگوں نے عیسائی شبہات کے جواب میں پورے زور سے قلم اٹھایا مگر ذہن چونکہ متاثر تھا، قلم لڑکھڑا گیا۔ ''امہات المومنین'' خطباتِ احمدیہ'' ''تفسیر احمد'' (مصنفہ سید احمد خاں) میں یہ چیز نمایاں ہے۔ جو حدیث مقاصد کے خلاف آئی اڑا دی گئی، جہاں کسی آیت کا مفہوم یا کوئی معجزہ نیچر سے منحرف ہوا اس کا حلیہ اس طرح بگاڑا اور تاویل و تحریف میں ایسا ترادف پیدا کیا جس پر ملائکہ بھی حیران ہو گئے۔

---

[1] جامع بیان العلم و فضله' باب ماجا فی ذم القول فی دین الله بالرای والظن والقیاس' ۲/۱۴۶۔

حکومت کو بھی اس سے فائدہ ہوا، ۱۸۵۷ء کے مظالم سے جن دلوں میں انتقام کی آگ جل رہی تھی انہیں ایک وقتی مشغلہ ہاتھ آ گیا۔ اس طریق فکر کے اثرات ملک میں مختلف انداز میں ظاہر ہوئے۔ اربابِ قادیان پر تاویل کا فیضان ہوا۔ مولوی عبداللہ چکڑالوی کو انکارِ حدیث کا سبق ملا۔ مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ ایسے اساطینِ علم و فضل بھی تھوڑے بہت اس سے متاثر ہوئے۔ مولانا فراہی کی تفسیر کے جو اجزاء عربی میں شائع ہوئے ہیں ان میں حدیث سے بہت کم استفادہ فرمایا گیا ہے مگر تورات اور انجیل کے رائج الوقت نسخوں سے کافی استفادہ کیا گیا ہے۔

درایت اور تفقّہ

مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے سیرۃ النعمان میں محدثین کے طریق فکر پر کڑی تنقید فرمائی، فقہائے کوفہ رحمۃ اللہ علیہم کے طریق فکر کی اس عنوان سے حمایت فرمائی کہ اگر وہ آج زندہ ہوتے تو شاید اس جدید انداز کی وکالت کو کبھی پسند نہ فرماتے۔ مولانا نے حدیث کا انکار نہیں فرمایا لیکن عقل کو درایت اور تفقہ کے نام سے اس قدر اہمیت دی جس سے حدیث اور ائمۂ حدیث کے مسلک کو انکار کے قریب قریب نقصان پہنچا، اور چند ایک اہل علم کے استثنا کے ساتھ تمام ندوہ کے متعلقین میں یہ مرض پایا جاتا ہے۔ اس حلقے میں یہ غلطی عام ہے کہ (۱) ائمۂ حدیث فقیہ نہ تھے، (۲) تنقید حدیث کے لیے جو اصول وضع کیے گئے ہیں ان میں درایت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، (۳) اصولِ درایت کے مطابق تنقید فقہا نے فرمائی، (۴) اور اب بھی ہر ایک کو حق ہے کہ اس نقطۂ نظر سے حدیث پر تنقید کرے، جسے چاہے رکھ لے اور جسے چاہے ردّی کی ٹوکری میں ڈال دے۔ (انا للہ) ۔ پھر درایت کا مفہوم ایسا عام بیان فرمایا جس سے حدیث کا قتلِ عام ہو سکتا ہے۔ سیرۃ النعمان میں مولانا فرماتے ہیں۔

''درایت کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی واقعہ بیان کیا جائے تو اس پر غور کیا جائے کہ وہ طبیعت انسانی کے اقتضاء، زمانہ کی خصوصیات، منسوب الیہ کے حالات اور دیگر قرائنِ عقلی کے ساتھ کیا نسبت رکھتا ہے۔'' [1]

[1] ابجدالعلوم' باب الدال المهملة علم دراية الحديث ۲/۲۸۵؛ مقدمة تحفة الاحوذي' ص ۲؛ كتاب مفتاح السعادة؛ مصباح السيادة' للبطاش كبرىٰ: ۲/۲ رقم ۱۹۸۔

''اقتضائے طبیعت'' وہی نیچر کا ترجمہ ہے۔ سرسید کا بھی یہی خیال تھا کہ نیچر کے خلاف کوئی چیز مقبول نہیں ہوسکتی۔

اس میں درایت کا مفہوم اس قدر آزاد کر دیا گیا ہے کہ اس پر کوئی پابندی نہیں رہی۔ اقتضائے طبیعت کی حد؟ اور اس اقتضا کا معیار کیا ہے؟ اور عقلی قرائن کی تعیین کون کرے، کیسے کرے؟ زمانہ کی خصوصیات نصوص کی راہ میں حائل ہوسکتی ہوں تو پرویز کے جرم پر بھی نظر ثانی ہو جانی چاہیے۔

عقل کو اس قدر وسیع اختیارات نہ قاضی عیسیٰ بن ابان نے دیئے تھے نہ معتزلہ کو یہ حوصلہ ہوا تھا۔ یہ گنوار کے ہاتھ کسوٹی اور پاگل کے قبضے میں تلوار دے دی گئی ہے، جو ان کے جی میں آئے کریں، دین کا خدا حافظ۔

آگے بڑھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ درایت کا مفہوم اہل علم کی زبان سے بھی سن لیا جائے تاکہ آج کی درایت اور پرانی درایت میں فرق ظاہر ہوسکے۔ اَلْعِلْمُ بِدِرَايَةِ الْحَدِيْثِ هُوَ عِلْمٌ بَاحِثٌ عَنِ الْمَعْنَى الْمَفْهُوْمِ مِنْ اَلْفَاظِ الْحَدِيْثِ وَعَنِ الْمُرَادِ مِنْهَا مُبْنِيًّا عَلٰى قَوَاعِدِ الْعَرَبِيَّةِ وَضَوَابِطِ الشَّرِيْعَةِ وَمُطَابِقًا لِاَحْوَالِ النَّبِيِّ ﷺ [1] (ابجد العلوم ایضاً مفتاح السعادۃ ومصباح السیادۃ) تاشکبری زادہ صاحب کشف الظنون، اصول حدیث اور درایت حدیث کو ایک ہی فن تصور فرماتے ہیں [2] درایت حدیث میں حدیث کے مطلب اور مراد سے عربی قواعد اور شریعت کے ضوابط اور آنحضرت ﷺ کے حالات کے مطابق بحث کی جاتی ہے۔''

اس درایت میں، اور جو درایت آج کل ہمارے بازار میں بک رہی ہے بڑا فرق ہے۔ مصطلح درایت میں علم ہے اور بصیرت ہے جب کہ ہمارے بازار کی درایت میں ذہنی آوارگی ہے اور پریشان خیالی ہے۔ شریعت میں عموماً اور حدیث میں خصوصاً اس قسم کی بے قاعدگی اور آوارگی کو جگہ نہیں دی جانی چاہئے۔ سرسید احمد خاں مرحوم نے اسی درایت کے حوصلہ پر جھٹکے اور حلال کو برابر کر دیا تھا۔ وہ دونوں کو حلال سمجھتے تھے۔

---

[1] سیرۃ النعمان، ص ۱۳۹۔ [2] کشف الظنون علم درایۃ الحدیث، ۱/ ۷۳۰۔

مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی

مولانا اصلاحی اور مولانا مودودی کا سکولِ فکر مولانا شبلی اور سرسید کے سکولِ فکر سے ملتا جلتا ہے۔ یہ حضرات بھی تفقہ اور درایت کے غائبانہ عاشق ہیں، مگر یہ ظاہر نہیں فرماتے کہ ان کے ہاں درایت کا کیا مفہوم ہے۔ مولانا شبلی نے جب درایت کی بحث چھیڑی تو اہلِ حدیث علما نے ان کا اس طرح تعاقب فرمایا کہ اس بحث کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہا۔ فقہا اور محدثین کی خدمات کو پوری طرح واضح فرمایا۔ مولانا عبدالعزیز اسلم آبادی کی حسن البیان، مولانا ابویحییٰ شاہجہان پوری کی الارشاد اور مولانا عبدالسلام مبارک پوری کی سیرۃ البخاری میں یہ موضوع اس طرح چھان پھٹک کر رکھ دیا گیا کہ آیندہ اس پر تفصیلاً لکھنے کی کسی کو جرأت نہ ہوسکی۔

مودودی صاحب نے ''دانشمندی'' سے کام لیا، درایت کو گول مول کر دیا، کچھ نہیں فرمایا کہ درایت سے ان کی کیا مراد ہے اور وہ کونسے اصول ہیں جو فقہا نے اس کے متعلق وضع فرمائے۔ البتہ محدثین پر تنقید فرماتے ہوئے ارشاد ہے:

''وہ (محدثین) زیادہ سے زیادہ یہی کہتے تھے کہ اس حدیث کی صحت کا ظن غالب ہے، مزید برآں یہ ظنِ غالب جس بنا پر ان کو حاصل ہوتا تھا۔ وہ بلحاظ روایت تھا۔ نہ بلحاظِ درایت، ان کا نقطۂ نظر زیادہ تر اخباری ہوتا تھا، فقہ ان کا اصل موضوع نہ تھا۔ الخ [1] (مسلک اعتدال: ص ۳۱۹)۔ مولانا اصلاحی مدظلہ تنقیدِ حدیث کے منصب کو اور بھی کھلا رکھنے کی کوشش فرماتے ہیں، ملاحظہ ہو۔

''وہ (نقاد حدیث) اخلاقی اعتبار سے بھی اتنا بلند ہو کہ اس نے دین بازی کو اپنا مشغلہ نہ بنا رکھا ہو، وہ حدیث پر نقد و تبصرہ کا اہل ہو۔ یہ منصب زہر ملائے مکتبی کا ہوسکتا ہے نہ دفتر کے کلرکوں کا۔'' [2]

پھر فرماتے ہیں: مشائخ کی اسانید، رسمی علوم کی تحصیل، مدارس کی تعلیم سے بھی یہ اہلیت حاصل نہیں ہوتی کہ حدیث پر تنقید کرسکے بلکہ

''میرے نزدیک آدمی کے علم و فضل کی بہترین سند اور بہترین شہادت اس کے اپنے

---

[1] تفہیمات مودودی، ص ۲۹۰۔ [2] ترجمان القرآن، ۴۵/ شمارہ نمبر۲ ص:۱۴۸، ۲۱ اکتوبر ۱۹۵۵ء

کارنامے اوراس کی دینی خدمات ہیں۔''

اصولاً کارناموں کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن اس معیار کے خطرات کو مولانا نے محسوس نہیں فرمایا۔ مرزا غلام احمد، عنایت اللہ خاں المشرقی اور پرویز وغیرہ حضرات تنقید کا حق اور حدیث کے ردوقبول میں حکم کی حیثیت اپنے کارناموں ہی کی بنا پر منوانا چاہتے ہیں۔ آپ رسمی علوم اور مشائخ کی اسانید کو نظر انداز فرما کر بعض اعتراضات سے بچ گئے ہیں مگر کارناموں اور خدمات کے عموم سے ایک دوسری مصیبت کی ذمہ داری آپ نے اپنے سر لے لی ہے۔ یہ آوارہ مزاج حضرات ''کارناموں اور خدمات'' کو اس طرح پھیلائیں گے کہ عوام کو ان کی گرفت سے بچانا مشکل ہوگا۔ مودودی صاحب کو بچا کر سارے فن کی مصیبت میں ڈالنا مناسب نہ ہوگا۔ حَفِظْتَ شَيْئاً وَغَابَتْ عَنْكَ اَشْيَاءُ۔ معیار اگر ''کارنامے اور خدمات'' ٹھہرا تو ان کی نوعیت ہر پانچ دس سال بعد ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔

خدمات اور کارنامے

خدمات اور کارنامے اگر حدیث پر تنقید کا معیار قرار دیئے جائیں تو ان کے لیے کوئی پابندی ہونی چاہئے۔ ہمارے آخری دور میں نواب صدیق حسن خاں رحمۃ اللہ علیہ، مولانا عبدالحیٔ لکھنوی، مرزا غلام احمد، مولوی احمد رضا خاں صاحب تصنیف و تالیف کے لحاظ سے مشہور ہیں، کیا ان سب کو حدیث پر تنقید کا حق دیا جائے گا۔؟ درس و تدریس کے مشاغل میں سید احمد خاں مرحوم، مولانا سید نذیر حسین رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے کارنامے اور خدمات دنیا کو معلوم ہیں لیکن تنقید کا حق کونسی خدمات اور کارناموں کے بعد دیا جائے گا۔

درایت اور کارناموں کو اگر کھلا اور آزاد کر دیا گیا تو یہ انکارِ حدیث کا پیش خیمہ ہوگا۔ مولانا مودودی اور آپ کی روشنی سے حدیث پر نقد میں ایسی فوضویت اور آوارگی کا راستہ کھول دے گی جس کی مضرت انکارِ حدیث سے کم نہیں ہوگی۔ اس آوارگی کا اندازہ ان چند پڑھے لکھے حضرات سے نہیں لگانا چاہئے جو آپ کے آگے پیچھے پھرتے پھراتے رہتے ہیں اور نہ ان چند اہلحدیث رفقا سے جو جماعتی پابندیوں کی وجہ سے منقار زیرِ پر رکھنے پر مجبور ہیں، جماعتی مصالح کی بنا پر وہ اپنا عندیہ کھل کر نہیں کہہ سکتے۔ اس کا اندازہ ان عوام سے لگانا چاہئے جو ملک

کے اطراف واکناف میں آپ کا لٹریچر پڑھتے ہیں۔ جب وہ حریم قیادت سے یہ سنیں گے کہ ائمۂ حدیث اصولِ درایت سے محروم تھے۔ ان کا نقطۂ نظر اخباری تھا، فقہی نہ تھا، جب انہیں معلوم ہوگا کہ مشائخ کی اسانید، مدارس کی تعلیم سے تنقیدِ حدیث کی اہلیت پیدا نہیں ہوتی تو وہ اپنے ذہن میں ائمہ اور دینی تعلیم کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے؟ وہ جب آپ کی زبان سے سنت کی محتاط اور سکڑی ہوئی تعریف سنیں گے، اخبارِ آحاد کی ظنیت کا وظیفہ سنیں گے تو اس ماخذ کے متعلق ان کے حسنِ ظن کو کس قدر ٹھیس پہنچے گی۔ حریم قیادت میں آنے کے بعد آپ کی ذمہ داریاں ''مکتبی ملا'' سے کہیں زیادہ ہوگئی ہیں جو فرمانا ہو اسے بہت سوچ کر فرمایئے۔

نہ ہر درایت سے فن حدیث میں مہارت حاصل ہوتی ہے نہ ہر کارنامے اور خدمت سے انسان ''رسول کا مزاج شناس'' بن سکتا ہے۔ اس کے لیے وہی لوگ موزوں ہوسکتے ہیں جن کے شب و روز کا مشغلہ حدیث ہے، جن کے عزیز اوقات قال اللہ وقال الرسول میں بسر ہوتے ہیں۔ قیادت پیشہ حضرات نہ ہیرا پہچانتے ہیں نہ جوت۔

مزاج شناسی اور جوت

مولانا مودودی نے مسلکِ اعتدال میں اصولِ حدیث اور ان کے قواعد کو ظنی اور انسانی مساعی کا نتیجہ کہہ کر ان کے مقام کو ہلکا کر کے [1] ''دین کے سسٹم''، ''مزاج شناسی'' اور ''ہیرے کی جوت'' پر نقدِ حدیث کا انحصار فرمایا اور پھر اسے ذوقی کہہ کر حدیث اور اس کی تنقید کو اس قدر بے اصول کر دیا کہ اس مسکین فن پر ہر منچلا زبان درازی کر سکے اور مولانا اصلاحی نے کارناموں اور خدمات کو معیار قرار دے کر اسے اور بھی کھلا کر دیا۔ یہ کشادگی نہ قاضی عیسیٰ بن ابان کے مسلک میں تھی نہ متاخرین فقہا میں' اس کی ''جوت'' کچھ تو معتزلہ سے ملتی ہے اور کچھ سر سید کی نیچر پرستی سے' بچارے اہل حدیث جو متاخرین فقہا اور قاضی عیسیٰ بن ابان سے شاکی تھے۔ وہ آپ کے اس تنقیدی جود و سخا پر کیسے مطمئن ہوتے۔ آپ حضرات کی یہ ساری کوششیں اس لیے تھیں کہ آپ ظن سے محفوظ رہ سکیں لیکن جہاں آپ اس وقت تشریف فرما ہیں وہاں ظن ہی ظن ہے۔ درایت ظنی، قیاس ظنی، علت ظنی، اس کا طرد و عکس ظنی، مزاج

[1] تفهيمات' مسلك اعتدال' ص ۲۹۳۔

شناسی ظنِ محض اور ہیرے کی جوت ظنی، محدثین کا بااصول فن آپ کی نظر میں اس لیے نہ جچ سکا کہ یہ انسانی کوشش ہے جو اپنی فطری حدود سے آگے نہیں جاسکتی، لیکن ''درایت'' اور ''دین کا سسٹم'' اور ''شریعت کا مزاج'' قیاس اور اس کی علل، یہ بھی تو انسانی مساعی کے نتائج ہوں گے۔ باقاعدہ ظن سے بھاگ کر آپ ذوقی اور بے قاعدہ ظن کے زیر سایہ آ گئے اور مسلکِ اعتدال کی تلاش میں بے اعتدالی کا شکار ہو گئے۔ ﴿وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ﴾

احادیث میں یقین اور ظن

ائمہ حدیث کی نظر میں قرآن عزیز اور متواتر احادیث سے یقین حاصل ہوتا ہے اور متواتر احادیث کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے، تواتر لفظی، تواتر معنوی، تواتر عملی کی تعداد سنت کے دفاتر میں کثرت سے موجود ہے لیکن دین کے تمام شعبوں میں تواتر نہیں پایا جاتا بلکہ اس کے لیے آحاد ہی کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ آحاد سے جو علم حاصل ہوتا ہے اسے بعض اہل علم نے ظن سے تعبیر کیا۔ گویا تواتر سے دوسرے مرتبہ پر جو علم حاصل ہوتا ہے اسے اصطلاحاً ظن کہا جاتا ہے۔ ظن زندگی کے تمام شعبوں میں پایا جاتا ہے۔ دینی اعمال کا فائدہ ظنی ہے۔ دنیا کے کاروبار اور ان کے نتائج ظنی ہیں، لغت ظنی ہے، الفاظ کی دلالت ظنی ہے، کعبہ کی سمت کا فیصلہ بعض اوقات ظن سے کیا جاتا ہے، جس ظن پر پوری زندگی کا انحصار ہے اسے نہ شرع نظر انداز کرسکتی ہے نہ عرف اور رواج۔ قرآن مجید نے اس ظن کو مستند سمجھا اور اس پر احکام مرتب کیے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک ظنی اطلاع پر مصر سے ہجرت کی، ایک لڑکی کی اطلاع پر مصر میں اسی جگہ پہنچے جہاں مدت تک قیام فرمایا، واپسی پر طور کا نظارہ ایک ظن کی بنا پر دیکھا اور نبوت سے سرفراز ہوئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مع حضرت ہاجرہ حجاز کے ویرانہ میں اقامت کا حکم دیا حضرت یوسف علیہ السلام کو خواب کی تعبیر کے صلہ میں جیل سے رہائی ملی اور اس کے ظنی عواقب کے پیشِ نظر حکومت سے سرفراز ہوئے' کنعان سے حضرت یعقوب علیہ السلام نے خبرِ واحد کی بنا پر مصر کے سفر کی تیاری فرمائی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تیہہ کی زندگی اس گمان پر اختیار فرمائی کہ بنی اسرائیل کو کسی وقت آرام ملے گا۔ غرض قرآنِ حکیم نے اخبارِ آحاد اور ظنی اطلاعات کو اس استناد کے ساتھ بیان فرمایا گویا اس میں وثوق اور یقین پایا جاتا ہے۔ عز بن عبدالسلام نے

القواعد الکبریٰ کے شروع میں وضاحت سے لکھا ہے کہ دنیا اور آخرت کے معاملات کا بہت حد تک ظن پر انحصار ہے، اس لیے امت نے ظن کی اصطلاح استعمال فرمانے کے باوجود آحاد اور ظنیات کو دین میں اسی قدر اہمیت دی ہے جس طرح ایک مستند چیز کو اہمیت دی جانی چاہیے۔ ظن کے اس اصطلاحی مطلب کو سمجھ لینے کے بعد یہ خیال کرنا کہ شریعت میں ظن کے لیے کوئی گنجائش نہیں، غلط ہے اور محض ایک وہم۔ بلکہ مظنونات کو ''غیر ثابت شدہ'' کہنا یا سمجھنا بھی غلط ہے البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ظنیات کا مقام تواتر کے بعد ہے۔ ظنون مصطلحہ تواتر سے متعارض نہیں ہوسکتے۔

فنِ حدیث اور عقل

یہ بھی صحیح نہیں کہ احادیث کی تنقید میں درایت کو اہمیت نہیں دی گئی، یا محدثین کا نقطۂ نظر اخباری تھا فقہی نہ تھا بلکہ جہاں تک عقل اور درایت کا مقام ہے اس کا پورا پورا احترام فرمایا گیا ہے۔ اہل حدیث اور فقہا کے طریق فکر میں اختلاف کا یہ مطلب قطعاً نہیں کہ ائمہ حدیث تفقہ سے بے خبر تھے، اختلاف تو خود فقہائے عراق میں بھی موجود ہے۔ علامہ دبوسی کی تاسیس النظر سے ظاہر ہے کہ فقہا رحمہم اللہ میں اصولی اختلافات موجود ہیں۔ یہ سب طریق فکر کا نتیجہ ہے، نہ فقہا حدیث سے بے بہرہ ہیں نہ ائمہ حدیث فقہ سے بے خبر۔ اختلاف کی وجہ صرف طریق فکر میں اختلاف ہے، اور نہ درایت اور ہیرے کی جوت سے یہ جوہری کوئی بھی بے خبر نہ تھا۔ رَحِمَهُمُ اللّٰهُ وَاسِعَةً۔ ابن قیم رحمہ اللہ اپنے شیخ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے نقل فرماتے ہیں۔

قَالَ وَقَدْ تَدَبَّرْتُ مَا اَمْكَنَنِيْ عَنْ اَدِلَّةِ الشَّرْعِ فَمَا رَأَيْتُ قِيَاسًا صَحِيْحًا يُخَالِفُ حَدِيْثًا صَحِيْحًا كَمَا اَنَّ الْمَعْقُوْلَ الصَّحِيْحَ لَايُخَالِفُ الْمَنْقُوْلَ الصَّحِيْحَ بَلْ مَتٰى رَأَيْتُ قِيَاسًا يُخَالِفُ اَثَرًا فَلَا بُدَّ مِنْ ضُعْفِ اَحَدِهِمَا. الخ [1] ''حسب امکان میں نے شرعی دلائل پر غور کیا ہے، میں نے صحیح قیاس کو صحیح حدیث کے خلاف نہیں پایا، جس طرح عقلِ صحیح نقلِ صحیح کے کبھی خلاف نہیں ہوتی۔ جب قیاس کسی اثر کے خلاف ہوتا ہے تو ان میں سے ایک ضرور ضعیف ہوتا ہے، لیکن قیاس صحیح اور فاسد میں تمیز کرنا آسان نہیں۔''

[1] اعلام الموقعین' مامن نص صحیح الا و هو موافق للعقل' ۲/ ۲۸۔

اسی قسم کی صراحت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی منقول ہے جسے طوالت کی وجہ سے نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قیاس اور عقل ایک چیز نہیں ہے، قیاس بھی عقل کے خلاف ہو سکتا ہے، اس لیے اصول فقہ کے قواعد کو عقلی اصول سمجھنا قطعاً غلط ہے۔ یہ اصول ایک خاص طریق فکر کی ترجمانی کرتے ہیں جس کی وضاحت شاہ صاحب نے حجۃ اللہ، انصاف اور عقد الجید وغیرہ میں فرمائی ہے۔ اس لیے اصولِ فقہ کو اصولِ عقلیہ سمجھنا کم فہمی ہے اور سادگی۔

ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مَا اَحْسَنَ قَوْلُ الْقَائِلِ اِذَا رَأَیْتَ الْحَدِیْثَ یُبَایِنُ الْمَعْقُوْلَ اَوْ یُخَالِفُ الْمَنْقُوْلَ اَوْ یُنَاقِضُ الْاُصُوْلَ فَاعْلَمْ اَنَّهٗ مَوْضُوْعٌ۔ [1]

ابوبکر بن طیب نے فرمایا: وضع کی یہ بھی نشانی ہے کہ وہ عقل کے خلاف ہو اور اس کی کوئی توجیہہ نہ ہو سکے اور جو حدیث حس اور مشاہدہ کے خلاف ہو وہ بھی موضوع ہوگی، قرآن مجید اور سنت متواتر کے خلاف ہو، یہ بھی موضوع ہوگی اور جو اجماع کے خلاف ہو اس کا بھی یہی حکم ہے۔ اھ [2] سخاوی نے بھی فتح المغیث میں اس کے قریب ارشاد فرمایا ہے۔

مولانا اصلاحی اور مودودی صاحب کے مضامین میں نقدِ حدیث کے متعلق جن نکات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، محدثین کی نظر اس سے بہت آگے ہے۔ یہ کس مسخرے نے آپ حضرات کو بتایا کہ محدثین نے اصولِ روایت کو نظر انداز کر دیا یا اُن کا نقطۂ نظر صرف اخباری تھا۔ پورے وثوق سے عرض کروں گا کہ نقدِ حدیث کے متعلق فقہائے عراق نے عقل کی روشنی میں آج تک کوئی اصل وضع نہیں کی۔ یہ مولانا شبلی مرحوم اور مولانا مودودی کا ایک ایسا خواب ہے جس کی کوئی تعبیر نہیں۔ یہ ایک ایسا تخیل ہے جس کا نفس الامر سے کوئی تعلق نہیں۔ تنقید حدیث کے متعلق آج تک جو کچھ ہی عقلی ہو یا نقلی، روایت کے نقطۂ نظر سے ہو یا درایت کے لحاظ سے، سب ائمۂ حدیث کی مساعی کا مرہونِ منت ہے، یہ میرا ہی خیال نہیں بلکہ آج سے

---

[1] تدریب الراوی، النوع الحادی و العشرون الموضوع ۳/۲۰۵۔

[2] تدریب الراوی، النوع الحادی والعشرون الموضوع، ۳/۲۰۴۔

چند سال قبل مولانا عبد الجبار عمر پوری، مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی، مولانا عبد العزیز رحیم آبادی، مولانا عبد السلام مبارک پوری ﷺ نے بھی پوری آواز سے اس کا اعلان کیا۔ یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ان کے اتباع واحفاد یہ سب کچھ دیکھتے اور جانتے ہیں لیکن خاموشی پر مجبور ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ۔

اصول اور قیاس میں ائمہ عراق کی کوششیں قابلِ صد ہزار تحسین ہیں، ان کی موشگافیاں علمی حلقوں سے داد حاصل کر چکی ہیں، لیکن معلوم ہے کہ وہ عقل کے اصول نہیں بلکہ وہ ایک خاص طریقِ فکر کی تخریجات ہیں جن کی غیر معقولیت جماعت اسلامی کے حلقوں میں بھی مسلم ہے۔ حال ہی میں مولانا اصلاحی کا ایک پرمغز مقالہ زکوٰۃ کی تملیک کے متعلق شائع ہوا جس میں احناف کے مسلک پر کھلی اور کڑی تنقید فرمائی گئی تھی اور مولانا مودودی نے بھی اپنے رسالہ پردہ میں بعض فقہی مسائل پر بڑی بے لاگ تنقید کی تو یہ خیال ہمارے اور آپ کے حلقوں میں مسلم ہے، اس لیے اس بحث میں آپ حضرات کا وقت ضائع کرنا مناسب نہیں۔

اصل نزاع

بحث اس میں نہیں کہ فہم اور تنقیدِ حدیث میں محدثین کے نزدیک عقل اور درایت کو دخل ہے یا نہیں کیونکہ پورے دین کا خطاب عقلمندوں سے ہے بلکہ بحث اس میں ہے کہ آیا ہر مدعی عقل کو یہ اجازت دے دی جائے کہ وہ کتاب وسنت کو اپنی عقل کی سان پر رکھ کر پرکھنا شروع کر دے اور جو حکم اس معیار پر پورا اتر سکے اس کا انکار کر دیا جائے یا اسے مآخذ کے لیے تعصب سے تعبیر فرما کر حقارت کی نگاہ سے ٹھکرا دیا جائے، آیا عقل و درایت کو احادیث اور سنت کے اس قتلِ عام کی اجازت ہونی چاہیے؟ ائمہ اور حفاظِ حدیث اور آج کے گنہگار اہل حدیث اس کے مخالف ہیں اور ان شاء اللہ رہیں گے، الفاظ کی تعبیر میں تنوع اور اسالیبِ کلام میں ہیرا پھیری سے حقائق نہیں بدل سکتے۔

جدید قیادتوں کے طریق فکر اور اہلحدیث کے طریق فکر میں بیّن اور کھلا اختلاف ہے، قدم اٹھانے سے پہلے پوری طرح سوچنا چاہیے اور جدید نظریات کے احتساب سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ مسائل چھان پھٹک اور بحث ونظر سے حل ہوتے ہیں، زبان درازی سے نہیں۔

میری رائے میں مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے نظریات نہ صرف مسلکِ اہلحدیث کے خلاف ہیں بلکہ یہ نظریات تمام ائمہ حدیث کے بھی خلاف ہیں۔ ان میں آج کے جدید اعتزال وتجہم کے جراثیم مخفی ہیں۔

آخری گزارش

مولانا نے سائل کا جواب نمبروار دیا ہے، میں نے ضروری مباحث کو لے لیا ہے اور اپنے مسلک کی حسبِ ضرورت وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔ نمبر ۶، ۷ کے متعلق بعض چیزیں کہی جاسکتی تھیں، لیکن میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ اس میں جماعتِ اسلامی کی تعریف میں مبالغہ آمیزی ہے جماعتی پراپیگنڈا اور دعایت ہے، اس کا مولانا کو حق حاصل ہے۔ حضری دعوت اور دعایت کا یہی طریق ہے اور بعض حصص میں مولانا مودودی صاحب سے عشق اور ان کے محاسن کا تذکرہ، ان کے علم، طریق کار اور جرأت کا اشتہار ہے۔ گو اس میں کتنا ہی مبالغہ اور تمادح ہو مگر کسی نظم کے ساتھ وابستگی کا یہ لازمی نتیجہ ہے، اس کا مولانا کو پورا حق ہے۔ اصل موضوع پر بقدرِ ضرورت گزارش کرنے کے بعد یہ چیزیں میرے موضوع سے باہر ہیں۔

اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اِتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلاً وَّارْزُقْنَا اِجْتِنَابَهٗ.

ان گزارشات کو یہاں ختم کرتے ہوئے طویل سمع خراشی کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ انتہائی اختصار کے باوجود گزارشات خاصی طویل ہوگئی ہیں اور مکرر گزارش کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ میرے دل میں دونوں بزرگوں کے لیے پورا احترام ہے۔ لیکن میں نے اپنے مسلک کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے اگر کوئی لفظ آپ حضرات کی شان کے خلاف ہو تو بصمیمِ قلب اس کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ لیکن اپنے مسلک کو کسی مصلحت پر قربان کرنا میرے لیے مشکل ہے۔ وَاَمَّا حُبُّ لَيْلٰى فَلَا اَتُوْبُ.

سُنّت قرآن کے آئینہ میں

حدیث اور سُنت عموماً ہم معنی استعمال ہوئے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے قول، فعل تقریر اور اجتہاد پر یہ دونوں لفظ بولے گئے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے ارشادات اُسی قدر قابل احترام ہیں جس طرح آنحضرت ﷺ کی ذاتِ مقدس۔ قرآن کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر پیغمبر کا اپنے اپنے دور میں یہی مقام ہے۔ ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ 1 ''ہر پیغمبر صرف اس لیے بھیجا جاتا ہے کہ خدا کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔'' بعض انبیا پر خاص آسمانی کتابیں نازل کی گئیں جیسے توریت، انجیل، زبور، قرآن، صحفِ موسیٰ علیہ السلام و ابراہیم علیہ السلام اور بعض پر صرف احادیث ہی نازل ہوئیں۔ وہی ان کی شریعت تھی اور وہی احکام۔ حضرت اسمٰعیل، اسحاق، یونس، لوط، ہود علیہم السلام وغیرہ اسی قسم کے انبیا تھے۔ ان پر بظاہر احادیث کے سوا کچھ بھی نازل نہیں ہوا۔ ان کی احادیث کی مخالفت کی وجہ سے ان کی امتوں پر عذاب نازل فرمایا گیا اور وہ رہتی دنیا تک بدنام ہوئے۔ ان انبیا کے متعلق کسی خاص کتاب کا ذکر نہیں فرمایا گیا اور نہ ہی احادیث میں ایسا تذکرہ آیا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی طرف دونوں قسموں کی وحی نازل فرمائی گئی۔ ﴿اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ﴾ 2 ''ہم نے تم پر اسی طرح وحی نازل کی جس طرح نوح علیہ السلام اور ان کے بعد آنے والے انبیا پر نازل ہوئی۔'' یعنی قرآن بھی نازل فرمایا گیا اور حدیث وسنت بھی۔

وحی کے مختلف طریقے

وحی کے طریقوں کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد ہوا۔

﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ﴾ 3

''انسانوں کے ساتھ گفتگو میں ہمارے اللہ تعالیٰ کے تین طریقے ہیں (۱) دل میں

---

1 ٤/النساء: ٦٤۔ 2 ٤/النساء: ١٦٣۔ 3 ٤٢/الشوریٰ: ٥١۔

الہام خیر، (۲) پس پردہ آواز یا فرشتہ (۳) بصورت پیغمبر آ جائے اور پیغام دے جائے۔

پہلے انبیا کے متعلق ممکن ہے کہ ان تینوں طریقوں کے مجموعہ سے انہیں مخاطب نہ فرمایا گیا ہو بلکہ کسی طریق سے ان پر وحی نازل ہوئی ہو لیکن آنحضرت ﷺ کے متعلق فرمایا۔ ﴿كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا﴾ [1] ''ہم نے تم پر اپنا امر اسی طرح وحی کیا۔''

یہ حدیث شریف کی وحی کے طریقے ہیں۔ قرآنِ عزیز کے طریق نزول کی وضاحت یوں بیان فرمائی۔ ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ۝﴾ [2] ''قرآن پاک بواسطہ روح الامین تمہارے دل تک پہنچایا گیا تاکہ تم ڈراؤ۔''

اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ خود قرآن عزیز سے معلوم کیا جائے کہ ارشادِ نبوی ﷺ اور ان کی اہمیت قرآن کی نظر میں کیا ہے؟ مُستقبل کی مشکلات رواۃ کے حفظ عدالت شذوذ اور علل کے نقائص مُنزلِ قرآن کی نظر سے پوشیدہ نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم تھا کہ سلسلہ روایت سے شکوک وشبہات اور ظنون کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ اس کے باوجود اگر قرآن عزیز، احادیث یعنی رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کی اہمیت کو قبول فرمائے تو ہمیں اعراض کا حق نہیں ہونا چاہئے بلکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قرآن علم کے اس شعبہ کو علی علاتہ قبول فرماتا ہے۔ ظنون اور شبہات کے باوجود اس کی ضرورت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تعلیم قرآن کا ایک جزو ہے اور وہ نقائص جن سے ہمارے شبہات میں اضافہ ہو رہا ہے اور جسے ہم شک، ظن یا وہم سے تعبیر کرتے ہیں۔ قرآن کی نظر میں یہ کوئی عیب نہیں ہے لہٰذا اس کی بنا پر احادیث کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ اگر حدیث کی حیثیت عام تاریخ یا حوادثِ روزگار کی ہوتی اور اُسے کوئی غیر معمولی اہمیت حاصل نہ ہوتی تو قرآنِ مجید اسے اتنی اہمیت نہ دیتا اور اس کے متعلق اتنے گہرے اور مضبوط ارشادات نہ فرماتا اور نہ ہی اسے بار بار دہراتا۔

قرآن مجید میں احادیث کا تذکرہ

قرآن عزیز میں احادیث کا تذکرہ دو طرح پر ملتا ہے (۱) رسول کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ

[1] ٤٢/الشوریٰ: ٥٢۔ [2] ٢٦/الشعرآء: ١٩٣۔ ١٩٤۔

کی اطاعت سے الگ باستقلال ذکر فرمانا (۲) آیات میں ایسے مقاصد کا ذکر جن کی تکمیل حدیث کے سوانہ ہو سکے۔ اس کے ذیل میں اُن آیات کا ذکر آئے گا جن میں دونوں قسم کے تذکرے موجود ہوں۔

(۱) ﴿مَآ اٰتٰـكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ ❶ ''رسول جو کچھ تمہیں دیں اسے لے لو اور جس سے روکیں رک جاؤ۔'' اٰتٰـكُمْ کو یہاں نَهٰكُمْ کے مقابلہ میں رکھا گیا ہے اور نہی کے مقابلہ میں امر ہوتا ہے اس لیے اٰتٰـكُمْ کے معنی اَمَرَكُمْ ہوں گے ۔یعنی آنحضرت ﷺ کے امر پر سختی سے عمل کرو۔ امر کا مفاد وجوب ہے اور نہی کا تقاضا حرمت، یعنی آنحضرت ﷺ جس چیز کا حکم فرمادیں اس کی پابندی واجب ہوگی اور جس چیز سے روکیں اس کا کرنا حرام ہوگا۔ آیت کا عموم آنحضرت ﷺ کی اطاعت کے وجوب پر مشتمل ہے فَخُذُوْهُ میں اسی وجوب وتاکید کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ آیت کو تقسیم غنائم پر محمول کیا جائے تو بھی اصل مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس میں بھی تقسیم آنحضرت ﷺ کے امر ونہی کی بناپر ہوگی۔ اس میں تشریع کے اختیارات آنحضرت ﷺ کو تفویض فرمائے گئے۔ وجوب و تحریم دونوں میں آنحضرت ﷺ کے ارشادات کو قطعی اور حتمی بتایا گیا اور لوگوں پر فرض کیا گیا۔ آنحضرت ﷺ کے امر ونہی کے بعد صرف اسی کی تعمیل کی جائے کسی دوسری چیز کے انتظار کی ضرورت نہیں۔ ہمارے نزدیک حجیتِ حدیث کا یہی مطلب ہے۔

(۲) ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ ❷ ''ہم نے رسول (ﷺ) بھیجا ہی اس لیے ہے کہ لوگ اس کی اطاعت کریں۔'' اس آیت میں رسالت کا مقصدِ حقیقی اطاعت قرار دیا گیا ہے اگر کوئی شخص رسالت یا رسول کو تسلیم تو کرتا ہے لیکن اس کی اطاعت اور اس کے احکام کے سامنے انقیاد کو ضروری نہیں سمجھتا، تو یقین کرنا چاہیے کہ وہ نبوت کی غایت اور اس کے مقصد سے ناواقف ہے کسی چیز کی غایت اور مقصد سے انکار کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی افادی حیثیت سے انکار کر دیا گیا اور اسے بے سود سمجھا گیا۔ معلوم نہیں کہ اس کے بعد کفر وجحود کس چیز کا نام رکھا جائے گا اور چونکہ پیغمبر کو یہ مقام اللہ کے اذن سے ملا ہے لہٰذا اس مقام کا انکار اللہ تعالیٰ کے ساتھ اعلانِ جنگ ہوگا۔ ﴿اَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْ ذٰلِكَ﴾

---

❶ ۵۹/الحشر:۷۔ ❷ ۴/النسآء:۶۴۔

(۳) ﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا○﴾ ❶

''اللہ کی قسم! ان میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک یہ لوگ آپ ﷺ کو حاکم نہ مانیں۔ پھر آپ کے فیصلوں کو دلی رضامندی سے بے چون وچرا تسلیم نہ کریں۔''

اس آیت میں چند امور قابلِ غور ہیں۔

(۱) باہمی نزاع اور اختلاف کا ذکر اصول موضوعہ اور مسلمات کی طرح فرمایا گیا ہے اور یہ اختلاف طبائع کا لازمی نتیجہ ہے یعنی اختلاف ضرور ہوگا۔

(۲) پھر اس کے رفع کی صورت صرف آنحضرت ﷺ کا فیصلہ ہے اور آپ کا حکم۔

(۳) اس کے قبول میں دل کے وساوس اور خطرات کی بھی اجازت نہیں دی گئی۔

(۴) معلوم ہوا کہ یہ نزاع اور فیصلہ دونوں قرآن عزیز کے علاوہ ہیں، اگر اس سے مراد دنیا کے باہمی جھگڑے بھی لیے جائیں اور رسول کے فیصلے کی حیثیت امیر اور حاکم وقت کے حکم کی ہو تو بھی اصل حجیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ آیت کا عموم دونوں کو شامل ہوگا۔

مگر رسول کی حیثیت منقسم ہوگی۔ دنیوی حیثیت سے وہ حاکم اور امیر ہے اور اپنے روحانی منصب کے لحاظ سے وہ پیغمبر ہے، اگر دنیوی حیثیت سے اس کے فیصلہ کے انکار سے ایمان کی نفی ہوسکتی ہے تو اس کے روحانی منصب سے اختلاف یا اس کی حجیت کا انکار تو بطریق اولیٰ ایمان کی موت کے ہم معنی ہوگا۔ اس لیے یہ آیت حجیت حدیث میں نص ہے۔ ﴿فَاَيْنَ الْمَفَرُّ﴾ ❷

(۴) ﴿مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا﴾ ❸

''اللہ اور اس کے رسول کے فیصلے کے بعد کسی مؤمن مرد اور عورت کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنی صوابدید اور پسند کو اس امر میں مداخلت کا موقع دیں اور اگر کسی نے اس کی خلاف ورزی کی تو اس کی گمراہی بالکل ظاہر ہے۔''

---

❶ ٤/ النسآء: ٦٥۔ ❷ ٧٥/ القيامة: ١٠۔ ❸ ٣٣/الاحزاب: ٣٦۔

(۱) آنحضرت ﷺ کے فیصلے کی قبولیت شرطِ ایمان قرار پائی ہے۔

(۲) فیصلہ کے بعد ذاتی پسند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(۳) اور اگر کوئی اپنی پسند پر اصرار کرے اور صوابدید کے مطابق فیصلہ کی سعی کرے تو اس کے لیے ضلال مبین کی وعید موجود ہے۔

(۴) اس قسم کے اختیار سے دستبرداری شرطِ ایمان قرار پائی ہے۔ آنحضرت ﷺ کے قول و فعل اور اجتہاد کی حجیت اس آیت سے بالکل واضح ہے اور اہلحدیث کا اس سے زیادہ کوئی جرم نہیں کہ وہ آنحضرت ﷺ کے مقام کو اس سے پست نہیں دیکھنا چاہتے۔ ہر صاحب امر کا حکم اپنے حلقۂ اثر میں حجت تصور کیا جائے لیکن رسول ﷺ کو اس معقول اور واجبی حق سے محروم رکھا جائے۔ کیوں؟۔

در حیرتم تمام کہ ایں چہ بو العجبی است

(۵) ﴿لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ۭ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ [1]

''رسول کی دعوت اور پکار کو تم اپنی باہمی پکار و دعوت کی طرح مت سمجھو (بلکہ رسول کی پکار واجب القبول ہے) اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو دوسروں کی آڑ میں حیلوں اور بہانوں سے آنحضرت ﷺ کی اطاعت سے بچنا چاہتے ہیں۔ جو لوگ آنحضرت ﷺ کے امر کی مخالفت کرتے ہیں اُنہیں ڈرنا چاہیے کہ کہیں کسی آزمائش یا دردناک عذاب میں مبتلا نہ ہو جائیں۔''

اس آیت کی تصریحات پر غور فرمائیے۔

(۱) آنحضرت ﷺ کی پکار کا حکم لوگوں کی معمولی اور معتاد گفتگو سے مختلف ہے۔ (باہمی گفتگو میں ایک دوسرے کی مخالفت کی جا سکتی ہے۔ آنحضرت ﷺ کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے) یہاں آنحضرت ﷺ کے فیصلہ سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔

[1] ۲۴/النور:۶۳۔

(۲) حیلوں بہانوں سے دوسروں کی آڑ میں بھی آنحضرت ﷺ کے احکام کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا بلکہ یہ منافقین کا طریق ہے۔

(۳) جو لوگ آنحضرت ﷺ کے احکام کی مخالفت کرتے ہیں (اُنہیں حجت نہیں سمجھتے) وہ عذابِ الیم کے مستحق ہیں۔ ﴿يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖ﴾ [1] لفظ مخالفین کے لیے از بس غور طلب ہے۔

(۶) ﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۝﴾ [2]

''نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور رسول اللہ (ﷺ) کی اطاعت کرو تم پر رحم کیا جائے۔''

﴿فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۝﴾ [3]

''نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے خوب واقف ہے۔''

ان دونوں آیات میں نماز اور زکوٰۃ کی طرح آنحضرت ﷺ کی اطاعت کو فرض قرار دیا گیا ہے۔ سورہ نور، سورہ احزاب، سورہ مجادلہ میں مقامِ رسالت اور اس کی اطاعت کا ذکر کثرت سے آیا ہے اور اس کی تاکید کے لیے اسلوبِ بیان میں عجیب حکیمانہ تصرف فرمایا ہے جس کی خوبی کا لطف وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جن کو عربی زبان سے کچھ تعلق ہے۔

سورہ نور میں اَلرَّسُوْلُ کو بقید تعریف ذکر فرمایا ہے جس سے مراد صرف محمد رسول اللہ ﷺ ہیں اور سورۂ مجادلہ میں اللہ اور رسول دونوں کا ذکر فرمایا ہے۔ مطلب ایک ہی ہے۔ اندازِ بیان بے حد لطیف ہے۔ رسولہ میں رسالت کو اپنی قرار دے کر رسول کو بھی اپنا لیا ہے۔

ے فی الجملہ نسبتے بتو کافی بود مرا

(۷) ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۝﴾ [4]

''اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔ تمہاری

---

[1] ۲٤/النور: ٦٣۔ [2] ۲٤/النور: ٥٦۔ [3] ٥٨/المجادلہ: ١٣۔ [4] ٣/آل عمران: ٣١۔

غلطیاں معاف فرمائے گا اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی محبت ایک مسلمہ مطلوب ہے۔ موحد اور مشرک دونوں اس کی طلب میں کوشاں ہیں۔ فرمایا: اس کی راہ صرف میری اتباع ہے اور اس سے نہ صرف تمہاری محبت کا اظہار ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کریں گے۔ محب ہونے کے بجائے تمہیں محبوبیت کا مقام حاصل ہوگا اور گناہ معاف ہو جائیں گے۔ محبوب کی لغزشوں سے درگزر کرنا محبت کا طبعی نتیجہ ہے۔ آنحضرت ﷺ کی اتباع کا وجوب کس حکیمانہ انداز سے بیان فرمایا ہے۔ محبت الٰہی کے سرفروش اور سرگردان متوالوں کو محبوبیت کا نسخہ بتا کر ان پر نوازش کی گئی ہے۔ عشق کے آرزو مندوں کو معشوق ہونے کی راہ بتا دی گئی ہے۔

عزیزاں را ازیں معنی خبر نیست
کہ سلطانِ جہاں با ما است امروز

یہ ساری نوازشیں آنحضرت ﷺ کی اتباع کے ساتھ وابستہ ہیں اور آنحضرت ﷺ کی عملی اطاعت اس عظیم الشان کامیابی کی ضامن ہے۔ کتنا تعجب ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ارشادات کی حجیت کا انکار کر کے محبت اور محبوبیت کی دونوں راہوں پر پہرے بٹھا دئے گئے ہیں۔

﴿وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَالَهٗ مِنْ هَادٍ﴾ [1]

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا اَرَاكَ اللّٰهُ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا۝﴾ [2]

''ہم نے تم پر کتاب یقیناً اس لیے اتاری ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی بصیرت سے لوگوں کے فیصلے کرو اور اس سلسلہ میں خیانت پیشہ لوگوں کی حمایت مت کرو۔''

(۱) کتاب حق اتارنے کی علت حکم نبوی کو قرار دیا ہے۔ اگر آنحضرت ﷺ کو فیصلہ کا حق نہ ہوتا اور فیصلہ قبول کرنا ضروری نہ ہوتا تو آنحضرت ﷺ پر کتاب اتارنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

(۲) یہ فیصلہ بھی وحی ناطق سے نہیں ہوگا اَرَاكَ اللّٰهُ میں یہ وضاحت فرمائی گئی کہ یہ فیصلہ سوچ و بچار اور اجتہاد سے ہوگا اور آنحضرت ﷺ اپنی رائے سے فرمائیں گے۔

---

[1] ۳۹/الزمر: ۳۶۔ [2] ٤/النساء: ۱۰۵۔

(۳) آنحضرت ﷺ سے عہد لیا گیا ہے کہ وہ کسی غلط آدمی کی حمایت نہ کریں۔

آیت میں معاملہ دوٹوک کر دیا گیا ہے۔ یا تو آنحضرت ﷺ پر نزولِ قرآن ہی کا انکار کر دیا جائے یا پھر آنحضرت ﷺ کے اجتہادات کو بھی من جانب اللہ سمجھا جائے۔ آنحضرت ﷺ کے ارشادات محض تاریخی سرمایہ نہیں بلکہ واجب التعمیل احکام اور حقیقتِ ناطقہ ہیں۔ ﴿مَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ ❶

ایک دھوکہ

بعض منکرین سُنت نے بڑی عنایت فرمائی۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم احادیث کا انکار نہیں کرتے بلکہ یہ تاریخ کا ایک قیمتی سرمایہ ہے اور مقدس تاریخی دستاویز ﴿كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ﴾ ❷ مقامِ نبوت کو سمجھ لینے کے بعد اسکا مطلب انکار نبوت کے سوا کچھ نہیں بلکہ آنحضرت ﷺ کی انتہائی توہین ہے۔ اس لفظی ملمع سازی کا اس کے سوا کوئی مطلب نہیں کہ آنحضرت ﷺ کا مقام ابن خلدون، ابن جریر، ابن کثیر اور دیگر مؤرخین کے پس وپیش ہوگا۔ ہر آدمی کو اس پر بحث وتنقید کا حق ہوگا۔ پیغمبر تاریخی مباحث کا تختۂ مشق ہوگا۔ بحث ونظر کی موشگافیاں نبوت کے ماحول پر محیط ہوں گی۔ یہ مقام تمام علما کا ہے بلکہ بحیثیت مورخ یورپ کے ملاحدہ نے بہترین تاریخی سرمایہ علم کی منڈیوں میں بکھیرا ہے جو اہل نظر کے لیے دعوت فکر کا سامان مہیا کر رہا ہے۔

ہمارے یہ دوست (اگر شرم وحیا دنیا سے نابود نہیں ہوگئی تو) غور کریں کہ یہ کونسا مقام ہے جو آپ آنحضرت ﷺ کو عنایت فرما رہے ہیں۔ ایک شخص اپنے باپ کے متعلق کہتا ہے کہ میں اس کا بیٹا تو نہیں لیکن ویسے وہ شریف آدمی ہے۔ یورپ کے اکثر بے دین آنحضرت ﷺ کو مقدس انسان سمجھتے ہیں لیکن پیغمبر نہیں سمجھتے۔ یہی حیثیت حضرات اہل قرآن نے انبیا کو عنایت فرمائی ہے۔ وہ دیانۃً سوچیں کہ مقامِ نبوت اور عام علم کے مقام میں کیا فرق رہا۔ ﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ ❸

---

❶ ۱۸/ الکھف:۲۹۔ ❷ ۱۸/الکھف:۵۔ ❸ ۲۴/النور:۶۳۔

دراصل ان حضرات نے شکست خوردہ ذہنیت پائی ہے۔ محققین یورپ سے عقیدت مندانہ تعلق نے اسلام اور...... اس کے عقائد، انبیا اوران کے مقام کوان کی نگاہوں سے اوجھل کردیا ہے ﴿فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ ○﴾ 1 بجائے اس کے کہ وہ اس علمی سرمایہ پر فخر کریں جسے صدیوں سے ائمہ نے اپنے پیغمبر کی وراثت سے حاصل کیا۔ یہ حضرات اس میں عار محسوس کرتے ہیں۔ اس پر ایمان سے ان کا دل ندامت محسوس کرتا ہے ﴿فَقَدْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِهِ عِلْمًا ○﴾

سُنت کے ان حصوں پر جن میں کچھ تاریخی تذکرے موجود ہیں۔ شاید تھوڑی دیر کے لیے یہ لفظ گوارا کیا جا سکے لیکن ''اوامر'' ''نواہی''، ترغیب وترہیب، زہد و ورع، اخلاق و عبادات اور اذکار وادعیہ پر کیونکہ تاریخ کا لفظ بولا جائے۔ ان حضرات نے اُس معاملہ میں اس ذہنی سخاوت کا ثبوت دیا ہے جسے علمی بدحواسی سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا بلکہ ان فقرات میں دھوکہ اور دجل ہے جو ایک حوصلہ مند ملحد اور دلیر کافر اور بہادر منکر کے لیے بھی مناسب نہیں۔ ان الفاظ میں نفاق کی بدبو ہے۔ ﴿وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ○﴾

ایسے الفاظ وہی زبانیں کہہ سکتی ہیں جن کے دل ایمان کی حلاوت سے خالی ہوں۔
اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ۔

(۹) ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾ 2

آپ ﷺ وحی کی تلاوت میں جلدی نہ کریں متفرقات کا جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ذمہ ہے جب ہم پڑھ چکیں تو تم پڑھو پھر اس کے مقاصد کا بیان کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے۔

(۱) آنحضرت ﷺ نزولِ وحی کے ساتھ ہی ضبط کرنے کی کوشش فرماتے تاکہ کوئی لفظ حفظ سے رہ نہ جائے۔ اس لیے فرمایا گیا کہ آپ اس فکر سے مطمئن رہیں۔ قرآن کا جمع کرنا اور پڑھانا اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔

(۲) ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾ 3 ۔ بیان کا مطلب یہاں اظہارِ مقاصد کے سوا کچھ

---

1 ۷۴/المدثر:۴۹۔ 2 ۷۵/ القیامة : ۱۶۔۱۷۔۱۹۔ 3 ۷۵/القیامة:۱۹۔

نہیں اور یہ جمع اور قرأت سے بالکل مختلف ہے۔ پہلی دونوں چیزوں کا مقصد الفاظِ قرآن کی حفاظت ہے۔ بیان سے مقصد اظہار مطلب ہے جو وحی کی روح ہے۔ اگر یہ محفوظ نہ ہو تو ان الفاظ کی حفاظت چنداں مفید نہ ہوگی وہی بیان ہے جسے آنحضرت ﷺ نے قول، فعل اور تقریر سے بیان فرمایا۔ اِنَّ حرف تاکید کے ساتھ عَلَيْنَا کو مقدم فرما کر بیان کی ذمہ داری بطور حصر اپنے ذمہ لے لی کہ بیان صرف ہمارے ذمہ ہے۔ اب سوچنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس بیان کو اس تاکید سے اپنے ذمہ قرار دیا ہے۔ (۱) آیا ہوا بھی یا نہیں؟ (۲) محفوظ بھی رہا یا نہیں؟ آیت سے اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اس بیان کی حفاظت کا ذمہ بھی لے لیا گیا ہے۔

(۳) اگر رواۃ اور روایت، اسانید اور رجال کے ظنون وشکوک اسے بیکار کر سکتے تھے انسانی علوم کی پیش بندیاں اسے غیر مستند کر سکتی تھیں تو پھر ﴿اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾ [1] کے مؤکد دعوے سے کیا فائدہ؟

(۴) اگر اس بیان کا مصداق اصطلاحی احادیث نہیں تو پھر یہ بیان دنیا میں کہاں ہے؟ بہر حال یہ قرآن عزیز کے لفظی وجود سے تو جدا ہے۔

(۵) اگر یہ بیان واقعی محفوظ نہیں رہ سکا اور یہ تاکید دیندارانہ رکھ رکھاؤ سے زیادہ نہیں تھی پھر الفاظ کی حفاظت سے کیا فائدہ؟ الفاظ کی حفاظت سے معانی اور مقاصد کی حفاظت تو نہیں ہوگی۔

(۶) اس کے ساتھ اس بات پر بھی غور کرنا ہے کہ آیا لغت کی حفاظت حدیث سے زیادہ کی گئی ہے؟ آیا قرآن کی زبان (عربی) انقلابات کی زد سے اب تک محفوظ ہے؟ ان گزارشات پر دانشمندانہ اور دیانتدارانہ غور کرنے کے بعد سنت کی حجیت واضح ہو جائے گی اور یہ قرآن ہی کا تقاضہ ہے اور قرآن ہی کا منشا۔

(۱۰) ﴿فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا﴾ [2]

ہم نے قرآن کو آپ (ﷺ) کی زبان پر آسان کر دیا ہے تا کہ آپ (ﷺ) بشارت و انذار دونوں مقاصد پورا کر سکیں۔"

---

[1] ۷۵/القیامۃ:۱۹۔ [2] ۱۹/مریم:۹۷۔

(الف)۔ ''لسان'' سے مراد عربی زبان ہو یا آنحضرت ﷺ کے ارشادات بصورتِ سنت و حدیث دونوں احتمال ہو سکتے ہیں۔ میری ناقص رائے میں دوسرا احتمال راجح ہے۔ صرف عربی زبان مراد لینا ٹھیک نہیں۔ یہاں لسان کی اضافت ''ک'' خطاب کی طرف ہے۔ معلوم ہے کہ عربی زبان لاکھوں آدمی بولتے ہیں۔ اس تخصیص اور اضافت سے کیا فائدہ؟ عربی زبان میں قرآن کا نزول ایک دوسری خوبی ہے جس کا تذکرہ قرآن نے دوسرے مقامات میں فرمایا ہے۔

اگر ''لسان'' مراد یہاں عربی زبان لی جائے تو لِتُبَشِّـرَ میں لام تعلیل بالکل بے کار ہو گا۔ یہ آنحضرت ﷺ کی خصوصیت نہ رہے گی بلکہ ہر اہل زبان ایسا کر سکتا ہے اس طرح آیت کی ترتیب میں کوئی خاص فائدہ نہ ہوگا۔

(ب) قرآن کی سہولت اور آسانی کو آنحضرت ﷺ کی زبان کے ساتھ مقید فرمانے کے بعد اس کی علت کے طور پر دو چیزیں ذکر فرمائی ہیں (۱) اہل تقویٰ کے لیے بشارت (۲) جدال پسند اور خصومت پرست لوگوں کو ڈرانا، معلوم ہے کہ یہ مقصد صرف الفاظ کی تلاوت سے حاصل نہیں ہو سکتا اس کے لیے افہام و تفہیم، وضاحت اور تشریح ضروری ہے اور اس سلسلہ میں عرب زبان دان اور عجمی برابر ہیں۔

اب اگر یہ تشریح اور وضاحت شرعاً حجت نہیں تو انـمـا سے حصر اور اس پر بشارت انداز کا ترتب، بے مقصد ہوں گے۔ نبوت اور اس کے مقاصد کی پوری عمارت زمین بوس ہو جائے گی۔ ہمارے ان مفکرین قرآن نے شاید قرآن عزیز کو کبھی سوچ کر نہیں پڑھا۔ ﴿ اَلَیْسَ مِنْکُمْ رَجُلٌ رَّشِیْدٌ ﴾ 1

(۱۱)۔ ﴿وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰی مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَی الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ کَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَهْتَدُوْنَ﴾ 2

''جب تم ان کو اللہ کی وحی اور اس کی رسول ﷺ کی طرف دعوت دیتے ہو وہ کہتے

---

1 ۱۱/هود: ۷۸۔ 2 ۵/المائدہ: ۱۰۴۔

ہیں ہمیں رسوم و عادات کافی ہیں جو اپنے بزرگوں سے ہمیں وراثت میں ملی ہیں گو وہ بزرگ علم و ہدایت سے یکسر خالی ہوں۔"

"الی الرسول" بصورتِ عطف مذکور ہوا ہے اور معلوم ہے کہ معطوف اور معطوف علیہ عام حالات میں دونوں مستقل ہوتے ہیں اور مغائر بالذات۔ جب ہم کہتے ہیں کہ ہمارے پاس روپیہ بھی ہے اور زمین بھی تو اس مثال میں روپیہ اور زمین ایک نہیں ہو سکتے بلکہ دونوں الگ الگ ہوں گے۔

مولوی عبداللہ چکڑالوی آنجہانی "الرسول" سے مراد بھی قرآن ہی لیتے تھے۔ میری رائے میں یہ جہل عظیم ہے اور عربی زبان سے ناواقفیت پر مبنی۔ اس لیے یہاں دعوتِ "الی الرسول" کا مطلب آنحضرت ﷺ کی سنت کی طرف دعوت کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا اور یہ دونوں بظاہر دو مستقل چیزیں ہیں اور دونوں کی حیثیت مساوی ہے۔ ((أُوْتِيتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ)) [1] الرسول دعوت آسمانی کا ایک مستقل رکن ہے جب ہر سنتِ صالحہ قابل اتباع ہے تو سنتِ رسول ﷺ کو اس سے کیونکر محروم رکھا جائے اسے تو اور زیادہ واجب الاطاعت ہونا چاہیے۔

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًاo اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا o وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهِ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًاo﴾ [2]

"جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں سے منکر ہیں وہ چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں میں تفریق قائم رکھیں وہ کہتے ہیں ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔ یہ لوگ یقیناً کافر ہیں۔ اور اہل کفر کے لیے توہین آمیز عذاب تیار کیا گیا ہے اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر یقین رکھتے ہیں وہ ان میں تفریق پسند نہیں

[1] ابو داؤد' کتاب السنة باب في لزوم السنة' ٤٦٠٤؛ مسند احمد' ١٣١/٤؛ مسند الشاميين' ١٣٧/٢؛ دلائل النبوة' ٥٤٩/٦؛ صحيح ابن حبان' المقدمة باب الاعتصام بالسنة باسناد صحيح: ١٨٩/١۔

[2] ٤/ النسآء: ١٥٠ تا ١٥٢۔

کرتے۔ان کوعنقریب ان کا اجر ملے گا۔اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔''

اس آیت میں اہل کفر اور اہل ایمان کا انداز بتایا گیا ہے۔اہل کفر اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبروں میں تفریق کرتے ہیں۔بعض کو مانتے ہیں بعض کا انکار کرتے ہیں۔اور یہ روش یقیناً کفر ہے اور اہل ایمان اللہ اور اس کے انبیا میں تفریق نہیں کرتے۔یہ لوگ عند اللہ اجر کے مستحق ہیں اور ان کے لیے اللہ کی رحمت اور بخشش یقینی ہے۔

اللہ اور اس کے رسول ذات اور وجود کے لحاظ سے تو الگ الگ ہیں مگر ایمان کے لحاظ سے وہ دونوں ایک ہیں۔دونوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ان میں تفریق کفر ہے۔رسول پر ایمان لانا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا۔آیت میں جن لوگوں پر قطعی کفر کا فتویٰ دیا گیا وہ اسی مقام پر تفریق کرتے ہیں بعض انبیا پر ایمان لا کر بعض دوسرے انبیا سے کفر کرتے ہیں یا اللہ پر ایمان رکھتے ہیں مگر پیغمبر کا انکار کرتے ہیں۔

﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا﴾ [1]

''جب انہیں اللہ کے احکام اور الرسول کی طرف بلایا جاتا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ منافق تم سے رکتے ہیں۔''

سابقہ آیت میں جس تفریق کا ذکر ہے وہ یہی معلوم ہوتی ہے۔آنحضرت ﷺ کے ارشادات سے اہل کفر و نفاق بھاگتے ہیں۔

اہل ایمان کی علامت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ وحی کی بعض اقسام کا اقرار اور بعض کا انکار نہیں کرتے۔وہ وحی پر کلیۃً ایمان لاتے ہیں۔ایمان باللہ اور ایمان بالرسول میں کوئی فرق نہیں کرتے۔

(۱۳) ﴿وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۝ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝﴾ [2]

''ستاروں کی ڈوبتی ہوئی روشنی گواہ ہے کہ آنحضرت (ﷺ) نہ بھولے ہیں اور نہ

---

[1] ٤/النسآء:٦١۔ [2] ٥٣/النجم:١-٥۔

ان سے اعتقادی لغزش رونما ہوئی ہے وہ ذاتی خواہش سے نہیں بولتے وہ تو صرف وحی سے فرماتے ہیں جو طاقتور فرشتے کی معرفت ان پر نازل کی جاتی ہے۔''

یہاں ضلالت وغوایت سے آنحضرت ﷺ کی عصمت کے تذکرے کے بعد ان کے تمام ارشادات کو وحی فرمایا ہے اور نفسانی خواہشات کی آمیزش سے پاک قرار دیا ہے۔

ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ فداہ ابی وامی کا ہر ارشاد نفسانی خواہشات سے پاک اور وحی الٰہی سے مؤید ہے وہ شرعاً حجت ہوگا اور قابلِ قبول۔ ﴿اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ٥﴾ [1] میں جس طرح حصر فرمایا گیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ رسول بوصف رسالت وحی کے بغیر بولتا ہی نہیں۔ اس لیے اس کی زبان سے قرآن کی تلاوت ہو یا سنت کا بیان وہ اگر بحیثیت رسول ہے تو وہ بجز وحی کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ عادی اور دنیوی امور وصفِ رسالت کے تابع ہی نہیں لہٰذا وہ وحی نہیں ہوں گے انہیں آنحضرت ﷺ ترک فرما سکتے ہیں۔ صحابہ کے مشوروں سے اسے نظر انداز فرما سکتے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آراء وافکار کو اس پر ترجیح دے سکتے ہیں۔ جنگِ بدر میں مقامِ جنگ کی تبدیلی، بریرہ کو مغیث کے متعلق مشورہ دینا اور بریرہ کو اس سے انکار پر رعایت دینا اس کی دلیل ہے کہ یہ معاملہ بلحاظ نبوت نہ تھا۔

(۱۴) ﴿ اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ ٥ وَوَضَعْنَا عَنْکَ وِزْرَکَ ٥ الَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَکَ ٥ وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ ٥﴾ [2]

''ہم نے تیرا سینہ کھول دیا اور تمہارا تمام تر بوجھ اتار دیا اور تیرے ذکر کو چار دانگِ عالم میں پھیلا دیا۔ آسانیاں اور مشکلات اس دنیا میں آتی جاتی رہیں گی آپ اپنے فرصت کے اوقات میں پوری توجہ سے بارگاہ ایزدی میں حاضری دیں۔''

اس سورۃ میں متعدد نعمتوں کو بصیغہ استفہام ثابت فرمایا ہے جن سے ظاہر ہے کہ شرحِ صدر کے بعد وہ تمام رکاوٹیں دور ہو جائیں گی جو غلطی کا مظنہ اور موجب بن سکتی ہیں اور جب وہ تمام بوجھ اتار دیے جائیں جو اس دنیا میں غلطی اور معصیت کا موجب ہو سکتے ہیں تو پھر ایسی محفوظ اور معصوم شخصیت جس کا دنیا میں اصل وظیفہ ذکر الٰہی اور شکر ہے۔ اس کے ارشادات کی

[1] ۵۳/ النجم: ۴۔ [2] ۹۴/الانشراح: ۱تا۴۔

حجیت ایک متدین اور عقلمند آدمی کی نظر میں کیونکر مشتبہ ہو سکتی ہے۔

اگر عام اربابِ تاریخ اور غیر معصوم علما کی طرح اس کے اقوال پر بحث ہو سکے انہیں غلط اور نا قابل حجت قرار دیا جا سکے تو رفع ذکر کی صورت کیا ہوگی۔ اس کا ذکر تو عامۃ الناس کی طرح ٹھہرا ﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ o﴾ 1 تو صرف وعدہ ہی رہا اس کی عملی صورت تو واضح نہ ہو سکی۔

امت سے بھی اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو شرح صدر کی نعمت سے سرفراز فرمایا ہے۔ انہیں دنیا کی قیادت سے بھی نوازا ہے اور یہ مقدس قیادت ہی دنیا کے لیے کامیابی اور سربلندی کی ضامن قرار پا سکتی ہے۔

ان عمومی القابات پر ایک نگاہ ڈالیے جن سے آنحضرت ﷺ فداہ روحی کو نوازا گیا اور دوسری طرف منکرین حدیث کی اس بے جوڑ حجت نوازی کو ملاحظہ فرمایئے کہ اس سراپا علم و دانش پیغمبر کے ارشادات امت کے لیے حجت ہی نہیں تو آپ محسوس فرمائیں گے کہ ان دونوں مقامات میں نہ ربط ہے نہ جوڑ۔ کجا وہ رفعت کہ ذات حق نے انہیں اپنے مخصوص خطاب سے سرفرازی بخشی اور کجا یہ انحطاط اور پستی کہ اس پاک باز اور مقدس شخصیت کے ارشادات کو شرعاً کوئی اہمیت ہی حاصل نہیں۔ أَيْنَ الثُّرَيَّا مِنَ الثَّرىٰ وَأَيْنَ الْخَصِيصُ الدَّانِىْ مِنَ السَّمٰوَاتِ الْعُلىٰ.

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِىْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ 2

''میں نے آج تمہارے لیے دین کو کامل کر دیا اور اپنے انعامات کی بارش برسا دی اور اسلام ہی تمہارے لیے پسندیدہ دین قرار پایا۔''

اس آیت کا بظاہر حدیث کی حجیت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس میں صرف دین کی تکمیل کا تذکرہ ہے لیکن جب ہم کامل دین کے مختلف شعبوں کو دیکھتے ہیں، عبادات، معاملات، مغازی، سیر، معاشی اور بین الاقوامی مسائل پر غور کرتے ہیں تو قرآنِ عزیز کو ایک اصولی

1 ٩٤/الانشراح: ٤۔ 2 ٥/المآئدہ: ٣۔

کتاب اور آئینی صحیفہ تصور کرنے کے بعد تفصیلات کے لیے ذہن میں تشنگی سی محسوس ہوتی ہے۔ اب اس تفصیل کے لیے اگر علما کا بورڈ مقرر کیا جائے یا کسی ذہین آدمی کو مرکزِ ملت بنا کر اس کی طرف رجوع کیا جائے تو یہ پورا غیر معصوم ماحول ظنون واوہام اور شکوک و مزخرفات کی ایک گٹھڑی ہوگی جسے ایک پاگل کے سر پر رکھ کر اسے اندھے اونٹ پر سوار کر کے مہار اس کے ہاتھ میں دے دی جائے تاکہ وہ اس موہوم امانت کو اپنی مرضی سے بانٹتا پھرے۔

كَبَهِيمَةٍ عُمْيَاءَ قَادَ زِمَامَهَا   أَعْمٰى عَلٰى عَوْجِ الطَّرِيقِ الْحَائِرِ

اگر یہ ظنون واوہام دین قرار پا سکتے ہیں تو پھر خبرِ واحد نے کیا جرم کیا ہے کہ اسے ساقط الاعتبار قرار دیا جائے اور علم الاسناد نے کونسا گناہ کیا ہے کہ اس پر تابڑ توڑ حملے کئے جا رہے ہیں۔ رجال اور اصولِ حدیث اور ایسے معقول اور متعارف فن کو کیوں نظر انداز کیا جا رہا ہے جس نے لاکھوں آدمیوں کی زندگیاں نکھار کر رکھ دیں۔ اور فنِ روایت ودرایت کو چھان پھٹک کر دنیا کو تاریخ کے اصولوں پر تنقید کا راستہ دکھایا اور تاریخ کو قصہ گوئی کے افسانوی دور سے نکال کر ایک منقح اور مستند فن کی حیثیت دے دی۔ اب دو ہی راہیں ہو سکتی ہیں یا تو اسے کسی خاندان یا بستی کا رواجی قانون قرار دے لیا جائے اور اس کی غیر محدود وسعتوں سے آنکھیں بند کر لیں جائیں یا سنت کو حجت تسلیم کر لیا جائے۔

اسلام کی وسعتیں

اگر اسلام پوری دنیا کے لیے ہے اور اس کی وسعتیں پوری کائنات پر محیط ہیں۔ وہ حقیقت ہے افسانہ نہیں اور اس کا انحصار یقینیات یا مظنونات علمیہ مستندہ پر ہے تو پھر تکمیلِ دین کے لیے سنت اور فنِ حدیث کی خدمات سے گریز ناممکن ہے۔ اس سے عبادات، معاملات، معاشیات، سیاسیات، حروب اور بین الاقوامی مسائل تک راہنمائی ملتی ہے اور وہ بھی وحی اور نبوت کی زبان سے جس کے سامنے ہزار مرکزِ ملت گھٹنے ٹیک چکے ہیں اور آئندہ بھی سرنگوں رہیں گے عقل وشعور کی دنیا میں ان مراکز ملت کو استشہاد اور یقین کا وہ مقام کبھی حاصل نہیں ہو گا جو دفاترِ سنت اور دواوینِ حدیث کو حاصل ہوا ہے۔ ﴿فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ ○ كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنفِرَةٌ فَرَّتْ مِن قَسْوَرَةٍ﴾ [1]

---

[1] ٧٤/ المدثر: ٤٩، ٥١۔

منکرین سُنّت کا عجز

دین کی وسعت میں انکارِ حدیث سے جو خلا پیدا ہوا تھا اسے پاٹنے کی پون صدی کی کوششیں تو ہمارے سامنے ہیں۔ اس عرصہ میں بچاری نماز ہی ان علما کا تختۂ مشق رہی آج تک یہ اربابِ تحقیق نماز کے وقت ہیئت اذکار، نوافل و فرائض واجبات رکعات اور ارکان تک کا فیصلہ نہیں کر سکے جو لوگ اتحاد کا نعرہ لگا کر اختلافات سے بچنے کا عہد لے کر نکلے تھے۔ اب تک سراپا اختلاف ہیں۔ صرف قرآن پر اعتماد کرنے کے بعد وہ چند گھڑیاں بھی اتفاق سے نہیں گزار سکے۔

اس امتِ مسلمہ کے حج وزکوٰۃ، صوم، معاملات، معاشیات، اور سیاسیات کو شکر ہے ان حضرات نے چھوا بھی نہیں۔ اگر دین کامل ہے اور اس کی تکمیل کا مطلب وہی وسعت ہے جس کا ذکر اوپر آیا ہے تو سنت اور اس کے دفاتر، احادیث اور ان کے ذخائر کو کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ ہم نے ان حضرات کے تراجم، حواشی اور ترجمانیوں کو بڑی نیک دلی اور پورے غور سے پڑھا ہے خدا شاہد ہے ہمیں وہاں علم و یقین کا شائبہ تک محسوس نہیں ہوا۔

انکارِ حدیث کا پس منظر

انکارِ حدیث احساسِ کہتری کی پیداوار ہے جس نے گریز پائی کی صورت اختیار کر لی ہے۔ جب یہ حضرات کسی مخالف کا اعتراض سنتے ہیں تو چونکہ یہ قرآن وسنت اور ان کے مستند ماخذ سے واقف نہیں اور ان کی توجیہ سے ان کا ذہن قاصر ہوتا ہے۔ اس لیے بھاگنا شروع کر دیتے ہیں۔ جس کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ نصوص کا انکار کر دیں اور احادیث کے متعلق تو وہ یہی ہتھیار استعمال کرتے ہیں کہ ہم اس حدیث کو نہیں مانتے۔

لیکن جب یہ مصیبت قرآنِ عزیز میں آ جائے اور قرآنِ عزیز ان کے تبحر فی الجہل کا ساتھ نہ دے سکے تو پھر ایسی تاویلات گھڑتے ہیں جس سے محسوس ہوتا ہے کہ شاید ان کے خیال میں رب العزت اتنی عربی بھی نہیں جانتے جس قدر کہ یہ متجر فی الجہل جانتے ہیں۔

آپ ابن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ کی تَاْوِیْلُ مُخْتَلَفِ الْحَدِیْثِ فِی الرَّدِّ عَلٰی اَعْدَاءِ اَھْلِ الْحَدِیْثِ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی مُشْکِلُ الْآثَارِ اورتی کی اَلْاَحَادِیْثُ الْمُشْکِلَہ ابن فورک کی مُشْکَلِ الْاَحَادِیْث ملاحظہ فرمائیں تو معلوم ہوگا کہ پرانے اہل بدعت حدیث کے کھلے منکر تو نہ تھے لیکن انہیں بعض احادیث اور بعض آیات سے ذہنی الجھن ضرور پیدا ہوئی۔ انہوں نے بھی دو راہیں اختیار کیں انکار یا تاویل۔ یہ نتیجہ ہے احساسِ کہتری کا جو قلتِ علم کی وجہ سے پیدا ہوئی۔

پھر عجیب یہ ہے کہ بعض احادیث کو یہ حضرات قابلِ اعتراض سمجھتے ہیں لیکن نظام ان سے استدلال کرتا ہے۔ حدیثِ تعریضاتِ ابراہیمی ہر منکر حدیث کے گلے میں اٹک رہی ہے نہ اگلتے بنتی ہے نہ نگلتے لیکن نظام کو دیکھئے وہ جھوٹ کے جواز میں اسی سے استدلال کرتا ہے اور اس حدیث کو اساس قرار دیتا ہے۔ ان گزارشات میں اگر کوئی تلخی ہو تو میں اس کے لیے دوستوں سے معافی چاہتا ہوں لیکن آرزو یہ ہے کہ ان گزارشات کو بغور پڑھا جائے اور سوچا جائے۔ پوری امت ایک طرف ہے اور آپ چند افراد ایک طرف۔

جملہ عالم یک طرف آں شوخ تنہا یک طرف

سُنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حجیت اور استقلال کا مفہوم قرآن میں اس قدر عام اور واضح ہے کہ سینکڑوں آیات اس موضوع پر جمع کی جاسکتی ہیں۔ توجہ کے لیے صرف چند آیات زیر قلم آئی ہیں تا کہ قرآن مجید کے طالب علم اس نہج پر سوچنے کی کوشش کریں، آیندہ کسی صحبت میں حدیث کی حجیت کا تذکرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی روشنی میں ہوگا۔ اور یہ ایک مستقل عنوان ہے کہ آیا جس شخص کی سیرت اس قدر بلند ہو اس کے اقوال واعمال کا مقام یا اس کی حیثیت صرف ایک مؤرخ کی ہوگی اور اس کے ارشادات صرف تاریخ کا ایک قیمتی اور مقدس سرمایہ۔ ناظرین اس کا انتظار کریں۔

قرآن وحدیث کا باہمی ربط

بعض آیاتِ قرآن عزیز میں اس طرح مذکور ہوئی ہیں کہ قرآن کا مفہوم حدیث کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ یہ قرآن کی آواز ہے جو ضرورتِ حدیث کو ثابت کررہی ہے۔ اشارة النص

کے طور پر قرآن مجید ضرورتِ حدیث کو ثابت فرماتا ہے۔ منکرین حدیث سے مؤدبانہ استدعا ہے کہ بحیثیت طالب علم قرآن میں اس طریق پر بھی غور کی تکلیف گوارا کریں۔ ممکن ہے اللہ تعالیٰ دلوں کو کھول دے اور قوتِ فہم کو استفادہ کا موقع ملے۔

① ﴿اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَا اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ﴾ [1]

''تحقیق گنتی مہینوں کی اللہ کے نزدیک سال کے بارہ مہینے ہیں۔ کتاب اللہ میں جس دن اس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو ان میں چار مہینے حرام ہیں۔''

ان چار ماہ کا ذکر قرآن میں اجمالاً آیا ہے۔ ان میں لڑائی جھگڑے کی ممانعت فرمائی گئی ہے ان میں ابتداء لڑائی حرام ہے۔ لیکن نہ قرآن میں بارہ مہینوں کے نام مذکور ہیں اور نہ چار ماہ کا کوئی تفصیلی ذکر موجود ہے۔ یہ تذکرہ احادیث میں ملتا ہے یا عرب کی تاریخ میں۔ معلوم نہیں ہمارے اہل قرآن کون سا مقدس ذخیرہ قبول فرمائیں گے۔

② ﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝﴾ [2]

''چور عورت ہو یا مرد اس کا ہاتھ کاٹ دو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے کیے کی جزا ہے۔ اللہ تعالیٰ غالب اور حکمت والا ہے۔''

ید کا لفظ عربی زبان میں ناخن سے لے کر کندھے تک بولا جاتا ہے۔ قرآن نے اس کے کاٹنے کا حکم دیا ہے لیکن اس کی حد بیان نہیں فرمائی، تواترِ عملی ثابت ہوتا ہے کہ چور کا ہاتھ کلائی سے کاٹنا چاہیے۔ اور اس کی بنا سنت پر ہے۔ سنت کی حجیت کا انکار کر دیا جائے تو ہاتھ یا تو بغل سے کاٹنا ہوگا یا کوئی اور مستند شرعی حد تلاش کرنی ہوگی۔ یہ قرآن میں سے سنت کے لیے ایک آواز ہے۔ قرآن کا مفہوم عمل کے لیے سنت کی توضیح کے بغیر صاف نہیں اور یہ دلیل ہے کہ سنت حجت ہے۔

③ ﴿اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى

---

[1] ٩/التوبة: ٣٦۔ [2] ٥/المائدة: ٣٨۔

الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُ وْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾ [1]

''جب نماز کا ارادہ کرو تو منہ کو دھولو اور ہاتھوں کو کہنیوں تک اور سر کا مسح کرو اور پاؤں ٹخنوں تک دھو ڈالو۔''

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْعَلٰى سَفَرٍ اَوْجَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْلٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ﴾ [2]

''اگر بیماری کی وجہ سے پانی کا استعمال مضر ہو یا حالتِ سفر ہو اور پیشاب یا پاخانہ یا لمس کی وجہ سے وضو ٹوٹ جائے اور پانی دستیاب نہ ہو سکے تو تیمّم کے لیے پاکیزہ مٹی منہ اور ہاتھوں پر مل لو۔ اللہ تعالیٰ مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا اور اپنی نعمت کو پورا کرنا چاہتا ہے تاکہ تم شکر کرو۔''

اس آیت میں وضو اور تیمّم کی وضاحت کی گئی ہے۔ وضو اس سے پہلے موجود تھا۔ ۱۲ نبوی بوقت معراج نماز فرض ہوئی۔ وضو بھی اس وقت بتا دیا گیا چنانچہ آٹھ سال آنحضرت ﷺ اس ہدایت کے مطابق نماز ادا فرماتے رہے اور باوضو نماز ہوتی رہی۔ آٹھ سال کے بعد ۶ ہجری میں سورۂ مائدہ نازل ہوئی۔ اس میں وضو کی ترتیب بتا کر آٹھ سال کے عمل کی تائید فرما دی گئی۔ آٹھ سال تک جو کچھ ہوا سنت کی بنا پر ہوا تھا۔ آٹھ سال بعد قرآن میں اس کی تائید فرما دی گئی۔ اگر حدیث حجت نہ تھی تو وضو کیوں کیا گیا اور ہو سکتا ہے کہ اپنے مسلک کی پیچ میں بے وضو نماز پڑھنے کو ترجیح دی جائے لیکن شاید عمل اس کے خلاف ہے۔

آیت کے دوسرے حصے میں تیمّم کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس میں ہاتھوں کا ذکر آیا ہے لیکن حد نہیں بتلائی گئی کہ آیا اس میں کلائی تک ہاتھ شامل ہوگا یا مرفقین تک یا بغل تک' کوئی وضاحت بھی قبول کی جائے۔ اس کی بنیاد سنت پر ہوگی۔ قرآن اس میں خاموش ہے اور قرآن خود توجہ دلاتا ہے۔ ان احکام کی عملی صورت آنحضرت ﷺ کے عمل سے معلوم ہوگی اور حجیت سنت کے لیے ایک اضطراری دعوت ہے۔

---

[1] [illegible] المائدہ [illegible]

آیت کے نزول اور وضو کی فرضیت میں آٹھ سال کے فرق کا ذکر پہلے علمانے بھی فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ مفتاح السعادۃ [1] الاتقان فی علوم القرآن للسیوطی۔ ابجد العلوم للنواب، کشف الظنون لچلپی وغیرہ میں ہے۔

وَمِثَالُ الثَّانِیْ آیَةُ الْوُضُوْءِ اَنَّهَا مَدَنِیَّةٌ اِجْمَاعًا وَفَرْضُهٗ کَانَ بِمَکَّةَ مَعَ فَرْضِ الصَّلٰوةِ وَکَآیَةِ الْجُمُعَةِ فَاِنَّهَا مَدَنِیَّةٌ وَالْجُمُعَةُ فُرِضَتْ بِمَکَّةَ کَذَاقِیْلَ وَالْحِکْمَةُ فِیْ ذَالِکَ تَاْکِیْدُ حُکْمِ السَّابِقِ بِالْاٰیَةِ [2]

''وضو کی آیت مدینہ میں نازل ہوئی اور وضو نماز سمیت مکہ میں فرض ہوا۔ اسی طرح جمعہ مکہ معظمہ میں فرض ہوا تھا لیکن سورۂ جمعہ مدینہ میں نازل ہوئی۔ ان حالات سے واضح ہوتا ہے کہ اثباتِ حکم میں سنت پر اعتماد کیا گیا اور قرآن میں اس کی تائید فرمادی گئی۔''

⑤ ﴿اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّکٰوةَ﴾ [3]

''قائم کرو نماز اور ادا کرو زکوٰۃ۔''

نماز اور زکوٰۃ کا حکم قرآن میں بار بار آیا ہے لیکن تعینِ اوقات، رکعات اور وظائف و اوراد کی تفصیل قرآن مجید میں نہیں۔ اسی طرح زکوٰۃ کی مختلف قسموں کے احوال میں نصاب کا تعیّن اور مقدارِ زکوٰۃ کی وضاحت قرآن میں نہیں جن حضرات نے ان تفصیلات کو سنت سے الگ طے کرنے کی کوشش کی ہے وہ اپنی کوشش میں بڑی طرح ناکام ہوئے ہیں۔ اس لیے خود قرآن مجید حجیت حدیث کا مطالبہ کررہا ہے۔

اہلِ قرآن سے

ادباً گزارش ہے کہ جہاں تک اسلام اور اس کی تعلیمات کا تعلق ہے سنت کی حجیت اور تسلیم احادیث کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ تعلیماتِ اسلامی میں اس کی حیثیت ایک ایسے جزو کی

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن' ١/١٤٤؛ ابجد العلوم' ٢/٥٠٦؛ مفتاح السعادة' علم معرفة ماتأخر حكمه عن نزوله' ٢/٢٤٦؛ كشف الظنون' ١/٧٦۔

[2] ابجد العلوم' علم معرفة ماتاخر حكمه عن نزوله ٢/٥٠٦۔ [3] ٢/البقرة:٤٣۔

ہے جس کے انکار سے حقیقت ایمان میں فرق آ جاتا ہے۔ انکارِ نبوت اور انکارِ فرامین نبوت میں چنداں فرق نہیں۔ ایمان پیغمبر کے جسم پر نہیں لایا جاتا۔ اس کے ارشادات پر ہی لایا جاتا ہے۔ جہاں تک ایمان و دیانت کا تعلق ہے، منکرین سنت اور انکارِ حدیث کے لیے یہاں ٹھکانا نہیں اور ''طلوعِ اسلام'' اور اس قسم کے دوسرے لادینی رسائل ذہنوں کی جس طرح تربیت کر رہے ہیں وہ یقیناً اسلامی تربیت نہیں بلکہ اس آزادی کو دیکھتے ہوئے جس کی تلقین ان لوگوں کا شیوہ ہو چکا ہے خیال پیدا ہوتا ہے کہ کسی باقاعدہ اور منظم کفر میں بھی ان کے لیے جگہ نہیں۔ یہودیت اور نصرانیت کفر ہیں لیکن ان کا قانون بھی توڑنے کے بعد انسان ان کی طرف نسبت نہیں کر سکتا۔ بت پرستی بھی ایک قانون ہے اور اس کی کچھ حدود ہیں۔ ایک آزاد منش آدمی وہاں بھی اس وقت تک رہ سکتا ہے جب تک وہ ان پابندیوں کو قبول کرے۔

میری دانست میں ہمارے ان آزاد منش حضرات کی جگہ یا اباحیت میں ہے یا اشتراکیت کی وسعتوں میں، کسی باقاعدہ مذہب میں (کفر ہو یا اسلام) ہمارے ان دوستوں کے لیے بظاہر کوئی جگہ نہیں۔



حجیت حدیث

آنحضرت ﷺ کی سیرت کی روشنی میں!

یہ گزارشات جو اس وقت ناظرین کے سامنے ہیں ان سے مقصود نہ تو کسی کا رد ہے اور نہ ہی مناظرہ، بلکہ قرآن حکیم میں غور کی ایک راہ ہے اور قرآن کے طالب علموں کے لیے سوچنے کا ایک نہج، عرصہ ہوا امام الہند قدوۃ اصحاب العزیمہ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے ''تذکرہ'' میں اس طریق فکر کی طرف کچھ ضمنی اشارات فرمائے تھے۔ اس کے بعد حضرت علامہ مولانا شیخ موسیٰ جار اللہ مہاجر موسیٰ رحمہ اللہ نے ایک مختصر سا مضمون اس انداز سے لکھا اور آنحضرت ﷺ کی سیرت کے چند پہلو قرآن سے استنباط فرمائے۔ راقم نے بھی ان کی اقتدا میں اپنی بے مائیگی کے باوجود یہ چند سطور لکھی ہیں۔ ادنیٰ توجہ سے معلوم ہوا کہ یہ موضوع قرآنِ حکیم میں بے حد مبسوط ہے، اور اگر سنجیدگی سے سوچا جائے تو آنحضرت ﷺ کی مقدس سیرت کا بہت بڑا ذخیرہ قرآن مجید میں موجود ہے۔ میری ناقص رائے یہ ہے کہ انکارِ حدیث کی راہ دراصل قرآن عزیز میں صحیح فکر کے فقدان سے پیدا ہوئی ہے۔ قرآنِ حکیم کا طالب علم غور اور تدبر سے قرآن کا مطالعہ کرے تو اسے یقین آجائے گا کہ قرآن عزیز کو کتاب اللہ اور کلام اللہ ماننے کے بعد آنحضرت ﷺ کے ارشادات کا انکار ممکن ہی نہیں۔ یہ بحث تو ہوسکتی ہے کہ فلاں حدیث آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے یا نہیں نیز یہ کہ آنحضرت ﷺ کے ارشادات کی چھان پھٹک کے لیے کون سے قواعد اور اصول زیادہ کارآمد ہوسکتے ہیں؟ لیکن کسی روایت کو حدیث تصور کرلینے کے بعد یہ بحث قطعی بے جا ہے کہ آیا حدیث حجت ہے یا نہیں؟

ائمہ حدیث کی دُور اندیشی

حدیث کی تنقید میں ائمہ حدیث اور فقہائے اسلام نے بڑی وسعت سے کام لیا ہے روایت، درایت، تاریخ، رجال ہر چیز کو آلاتِ تنقید کے طور پر استعمال فرمایا پھر تغیر احوال کے ساتھ یہ اصول بھی بدلتے رہے ایک وقت میں مرسل روایت کو حجت مانا گیا، لیکن جب

حالات کے تقاضے بدلے تو مرسل کی حجیت پر بھی پابندیاں لگا دی گئیں۔ بلکہ مرسل کو ضعیف کی قسموں میں شمار کیا کما وح بہ الشافعی فی الرسالۃ، اسی طرح اتصالِ سند میں امکان لقا کے بعد وقوعِ لقا پر زور دیا گیا۔ نیز مقارنت اور امکان لقا کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا گیا (شروح بخاری و مقدمہ صحیح مسلم) روایت اور درایت کی تقدیم و اعتبار میں بڑی سنجیدگی سے غور فرمایا گیا اور ہر چیز کی اہمیت بلحاظ مقام ملحوظ رکھی گئی، تنقید میں بے اعتدالی اور اپنی عقل کو نصوص پر مقدم کرنے کے لیے اگر کوئی بہانہ بنایا گیا تو اس کی مخالفت اب بھی ہوگی لیکن عقل کی جائز مراعات سے کبھی انکار نہیں کیا گیا۔ فطری قواعد اور متواتر امور اور قرآن عزیز کے توافق کی اہمیت کو محدثین اور ائمہ سنت نے بھی نظر انداز نہیں فرمایا جزاھم اللہ عنا و عن المسلمین خیر الجزاء۔

تنقیدِ احادیث اور اجتہاد

تنقیدِ احادیث میں حافظ ابن صلاح کی یہ رائے تھی کہ اس میں اجتہاد کی اجازت نہ دی جائے کسی شخص کو متقدمین ائمہ کے بعد تنقید کا حق نہ دیا جائے لیکن ائمہ حدیث میں یہ رائے حافظ ابن صلاح رحمہ اللہ کی جلالتِ قدر [1] کے باوجود تسلیم نہیں کی گئی بلکہ ائمہ نے وسعتِ ظرف کے ساتھ اس معاملہ میں تحقیق کی اجازت دی۔ حافظ دار قطنی نے صحیح پر استدراک فرمایا امام حاکم کی مستدرک اسی قسم کی کوشش ہے۔ مسند ابو عوانہ کا انداز بھی صحیح مسلم پر استدراک ہی کا ہے۔ ان استدراکات پر تحقیقی جوابات بھی ائمہ نے دیئے مگر ان وسعتوں کے باوجود صحیحین کا مقام گرایا نہیں جا سکتا بلکہ یہ ائمہ ان استدراکات کے باوجود صحیحین کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے رہے اور حدیثِ نبوی ﷺ کو حجت سمجھتے رہے بلکہ ابتدائی دور کے محدثین نے انفراداً بعض احادیث پر ان کے مضامین کے لحاظ سے اعتراض کیا لیکن نہ ان کے مقام کا انکار کیا اور نہ حدیث کی حجیت ہی پر کوئی شبہ کیا ائمہ حدیث کی طرف سے ان انفرادی اعتراضات کا بھی مناسب اور حتمی جواب دیا گیا حافظ ابن قتیبہ دینوری کی کتاب **تاویل مختلف الحدیث فی الرد علی اعداء اهل الحدیث** ایسی قیمتی کتاب اسی موضوع پر ہے اور حافظ طحاوی کی مشکل الآثار بھی اسی مقصد کے لیے لکھی گئی اور انفرادی شبہات کا کافی حد تک ازالہ کر دیا گیا مگر

---

[1] مقدمة ابن صلاح، معرفة الصحیح من الحدیث ص ٢٣۔

اس دور میں فنِ حدیث کی مجموعی حیثیت پر اعتراض کا حوصلہ کسی کو نہیں ہوا۔ زمخشری ایسے بالغ النظر لغوی اور ادیب نے اعتزال آمیز آزادی کے باوجود احادیث کا ذکر کیا اور اکثر معجزات کو تسلیم کیا جن کو خود ائمہ حدیث قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے بلکہ ائمہ حدیث کو قاضی بیضاوی اور زمخشری کی احادیث کے لیے تخریج کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ یہ غیر مستند ذخیرہ صحیح احادیث کی اہمیت پر اثر انداز نہ ہو سکے۔

جہل بالقرآن اور انکارِ حدیث

حدیث کی حجیت کا انکار زمانہ جہل کی پیداوار ہے۔ انکارِ حدیث کی ابتدا ان لیڈر منش علما کی طرف سے ہوئی جو انگریزی تعلیم اور انگریز بہادر کی پیداوار ہیں۔ مولوی عبداللہ چکڑالوی کے علاوہ یہ تمام حضرات عموماً اسلامی علوم کو انسائیکلوپیڈیا سے حاصل کرنے کے عادی ہیں۔ یہ قرآن کی تاریخ اور پیغمبر اسلام علیہ السلام کی سیرت کو مسٹر نکلسن سے سیکھنا انتہائی تحقیقات تصور کرتے ہیں ان کی اکثریت ایسی ہے جنہوں نے اسلامی علوم کو اسلامی ماخذ سے حاصل نہیں کیا بلکہ اسلامی علوم کو یورپین مستشرقین اور انگریزی زبان کے توسط سے سیکھا ہے ترجمہ قرآنِ عزیز میں جن حضرات کا مدار مسٹر ولیم میور پر ہے اگر وہ حدیث کا انکار کریں تو انہیں کون روکے اور کیونکر؟ مدیر طلوعِ اسلام، علامہ عنایت اللہ مشرقی اور مولی احمد دین امرتسری یہ تمام علامہ صاحبان انگریز بہادر کی پیداوار ہیں اور ان کی معلومات میں انگریزی طریقِ فکر کارفرما ہے۔ ﴿جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُومٌ مِّنَ الْأَحْزَابِ ۝﴾ [1] مولوی عبداللہ بچارے ضرور قدیم وضع کے تھے تاہم اسلامی علوم کی تکمیل کا موقع ان کو بھی میسر نہ آسکا نیز کچھ برتری کا شوق بھی ان کو دامن گیر تھا جو حالات کی نامساعدت کے سبب پورا نہ ہوسکا شیخ محمد چٹو صاحب کی تاجرانہ ذہنیت نے مولوی عبداللہ کو حسبِ منشا کام کا موقع ہی نہ دیا۔ یوں بھی مولوی عبداللہ بچارے کچھ زیادہ ذہین نہیں تھے الف لام اور تنوین سے جس طرح انہوں نے مسائل کشید کرنے کی کوشش کی وہ اہل علم کی محفلوں میں مضحکہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ نحو کی اس منطق سے اہل زبان بھی یقیناً ناآشنا ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا ترجمہ اور تفسیر جن لوگوں کی نظر سے گزری ہے وہ آسانی سے

[1] ۳۸/ ص: ۱۱۔

یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ یہ کسی ذہین اور ذکی آدمی کا کام نہیں۔

اصول حدیث میں وسعت

مقصودِ کلام یہ ہے کہ انکارِ حجیتِ حدیث کی بحث سرتا سر قلتِ مطالعہ کی پیداوار ہے۔ ائمہ حدیث نے ظرف وحال کے مطابق کچھ اصول وضع فرمائے اور آنے والے لوگوں کے لیے راستہ کھلا چھوڑ دیا تا کہ وہ رجال اور اسانید پر دیانت کی روشنی میں بحث کریں۔ جس حدیث پر انہیں شبہ ہو اسے ظاہر کریں اس کی سند پر بحث کریں اُسے درایت کی روشنی میں سمجھیں اور اس کے لیے اہل علم کی طرف رجوع کریں اگر تسکین نہ ہو تو شبہات کو اس حدیث تک محدود رکھتے ہوئے توقف کریں البتہ بحث جاری رکھیں۔ ﴿لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ۝﴾ [1] مگر فن پر ہاتھ صاف کرنے کی کوشش یقیناً ایک ملحدانہ کوشش ہے۔ امت کے اعمال اور علمی خدمات کے ساتھ یہ وطیرہ احسان فراموشی ہے ان کے علوم سے استفادہ کے بعد ان پر بدگمانی کو احسان فراموشی سے ہی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ آج کے نو آموز اکتشافی محققین اگر سوچیں تو انہیں یقین ہوگا کہ آج الٹا سیدھا جو کچھ کہا یا لکھا جا رہا ہے یہ متقدمین کا فیضان ہے اور ان کی علمی مساعی کا نتیجہ ہے اس استفادہ کے بعد ان پر زبان درازی اچھے اخلاق کا مظاہرہ نہیں۔

مخالفین حدیث سے شکوہ

مخالفین حدیث کے پورے کیمپ سے ہمیں یہ شکوہ ہے کہ ان حضرات نے ہمیشہ خبط اور خلطِ مبحث کی کوشش کی۔ ان کا دعویٰ تو یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے اقوال، افعال، اجتہادات شرعاً حجت نہیں وہ خدا کا پیغام (قرآن) تو دے سکتے ہیں لیکن اس کی وضاحت کا ان کو حق نہیں اور اگر وہ اس پر عمل کریں تو وہ عمل اُمت کے لیے حجت نہیں۔ اُن کی صوابدید ان کی ذات تک محدود ہے ہم اس کی تعمیل کے مکلف نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں سند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو لوگ آنحضرت ﷺ سے بالمشافہ گفتگو فرماتے تھے ان پر بھی شرعاً اسے قبول کرنا ضروری نہ تھا۔ لہٰذا اگر یہ احادیث کے ذخائر تواترِ نقل سے بھی ہم تک پہنچ جائیں تو بھی بلحاظ اقوال رسول

---

[1] ٦٥/الطلاق :١۔

یہ حجتِ شرعی نہیں ہیں۔ حجتِ شرعی صرف پیغام کے الفاظ یعنی قرآن ہے اور اسی طرح اگر آنحضرت ﷺ اپنی زندگی میں احادیث کا مجموعہ لکھوا دیتے اور وہ مجموعہ آج قرآن کی طرح ہمارے ہاتھوں میں ہوتا پھر جب تک وہ قرآن کے موافق نہ ہوتا ہم اُسے قطعاً شرعی حجت نہ سمجھتے بلکہ اگر ہماری سمجھ اور ہمارے علم کی رو سے قرآن کے موافق اس کا مفہوم نہ ہوتا تو بھی ہم قرآن کو ترجیح دیتے اور وہ مفہوم جسے ہماری عقل قرآن تصور کرتی ہے اُس کو حدیث کے اس مسلّم الثبوت مجموعہ پر ترجیح ہوتی۔ اس عقیدہ کے بعد سند یا تدوین حدیث کے اوقات یا حفظ حدیث کے ظرف کی بحث بالکل بے فائدہ ہے یا کم از کم یہ ایک ثانوی بحث ہے جس پر ایک ضمنی دلیل کے طور پر تو بحث کی جا سکتی ہے لیکن انکارِ حدیث کے لیے اسے مستقل دلیل کا مرتبہ نہیں دیا جا سکتا۔

خلطِ مبحث

ان گزارشات سے ایک مقصد یہ بھی ہے کہ خلطِ مبحث کی یہ روشنی ختم ہو جائے اس لیے الاعتصام میں چند اقساط ظنِ حدیث کی مختلف حیثیتوں کے متعلق سپردِ قلم کی گئیں جن میں مَیں نے کوشش کی ہے کہ خلطِ مبحث سے بچوں اور اپنے دوستوں کو بھی بچاؤں تاکہ افہام و تفہیم میں کم سے کم وقت صرف ہو اور ہم ایک دوسرے کو زیادہ سے زیادہ سمجھ سکیں۔ میں نے ان قریبی اقساط میں حدیث پر بلحاظِ علم روایت، بلحاظِ اوقاتِ تدوین، بلحاظِ اصولِ روایت، بلحاظِ درایت، بلحاظِ رجال بالکل بحث نہیں کی کیونکہ ان حیثیات کا مقام ثانوی ہے۔ ان حیثیات پر بحث آیندہ صحبتوں میں ہوگی اور ان شاء اللہ مفصل ہوگی، وَاللّٰهُ وَلِيُّ التَّوْفِيْق۔

زیرِ قلم گزارش آنحضرت ﷺ کی کامل سیرت کے نقطۂ نظر سے ہے۔ جس شخص کی سیرت اتنی مکمل ہو جیسے کہ قرآن ذکر فرماتا ہے۔ آیا اُس شخص کے اقوال حجت ہوں گے یا نہیں؟ دوسری طرف ایک اہل قرآن انکارِ حدیث کے لیے دنیا کو قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ حالانکہ وہ زبان نہیں جانتا۔ علوم اسلامیہ سے نابلد ہے لیکن پیغمبر کو جس کی سیرت یہ ہے یہ حق نہیں کہ وہ اپنا فہم لوگوں کے سامنے پیش کر سکے۔ اور نہ ہی لوگ اس کے پابند ہیں کہ وہ اس کے کامل اسوہ کا اتباع کریں۔ ﴿تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى﴾ [1]

---

[1] ۵۳/النجم: ۲۲۔

اعترافِ حقیقت

مناظرانہ حیثیت سے یہ مضمون کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ان گزارشات کا ماحصل آنحضرت ﷺ کی علمی خصوصیات ہیں۔ کمالات ہیں، اصابتِ فکر کے قرآنی تذکار ہیں اللہ تعالیٰ کی رہنمائی اور حفاظت کا اظہار ہے جو مختلف مواقع پر آنحضرت ﷺ کے شاملِ حال رہی۔ صاحب وحی کی مقدس سیرت کے مختلف پہلو ہیں جن کے اظہار میں صرف قرآن عزیز پر انحصار کیا گیا ہے ان کی بصیرت اور دوررس نظر کا اظہار ہے۔ ایسی خصوصیات اگر دنیوی معاملات میں کسی شخص کے اندر پائی جائیں تو دنیا میں اس پر اعتماد کرنا اخلاقی فرض ہو جاتا ہے اور عقل کا واجبی تقاضا۔ میری دانست میں یہاں دین کا معاملہ بھی دنیا سے جدا نہیں اگر یہ خوبیاں دُنیا میں اعتبار اور اعتماد کا سبب بن سکتی ہیں تو دین میں بھی انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اعتماد ایک نفسیاتی کیفیت ہے۔ جو ان خصائص سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ کیفیت اور اس کے اسباب اور مقتضیات دین اور دنیا میں مختلف نتائج کے حامل نہیں ہو سکتے۔ اس کے باوجود اگر کوئی بزرگ آنحضرت ﷺ اور دوسرے انبیا کو اس حق سے محروم رکھنے پر مصر ہو تو میں اقرار کرتا ہوں کہ ان گزارشات میں اُسے مجبور کرنے کا کوئی سامان نہیں۔ میں نے دس آیات سے آنحضرت ﷺ کی زندگی کے بعض پہلوؤں کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر طالب علم سوچنا چاہے تو اس موضوع پر اسے سینکڑوں آیات ملیں گی جن سے مقامِ نبوت کی تشخیص کی جا سکتی ہے۔

طمانیت کا سامان

میں پورے وثوق اور دیانت سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے اس موضوع پر برسوں سوچا، مناظرات کے سینکڑوں صفحات پڑھے۔ اہل سنت علما سے بہت کچھ سنا۔ اہل قرآن کے انتہا پسند اور دیانت دار بزرگوں سے زبانی گفتگو کی اور اس لادینی عقیدہ کا اُن بزرگوں نے دیانت داری سے اظہار کیا۔ اور آج کل کے مصلحت کوش منافقین کی مساعی کا بہت سا حصہ بھی میری نظر میں ہے ان کی دعوت کے ظاہری الفاظ کو سمجھتا ہوں اور ان کے مافی الضمیر کو جہاں

تک قرائن واحوال سے سمجھ سکتا ہوں۔ دیانتداری سے اس کے سمجھنے کی کوشش کی ہے مجھے اس مبحث میں کسی چیز سے اُس قدر تسکین نہیں ہوتی جس قدر اطمینان مجھے آنحضرت ﷺ کی سیرت کے اس نہج سے ہوا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی سیرت دواوین سنت میں بہت مبسوط ہے اور اس سے بھی ایک طالب کو انشراح کا بہت کچھ سرمایہ میسّر آ سکتا ہے لیکن قرآن عزیز کے جمال واختصار میں جو لطف وطمانیت پنہاں ہے اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکیں گے جو اس طریق پر سوچنے کی کوشش کریں گے۔ اس طریق پر سوچنے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ دل اور دماغ رسمی آلائشوں سے بالکل پاک ہوں۔ فطرت کے دائمی اور قدیمی اصول پیش نظر ہوں اور ان کے نفسیاتی اثرات سے کوئی طالب علم فطرتاً آشنا ہو تو مُعاملہ بہت جلد حل ہو سکتا ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ رسمی مناظرات سے فطرت کی یہ قوت ہی ناپید ہو جاتی ہے اس لیے مناظر یقیناً اس افادی حیثیت سے محروم ہو جاتا ہے اُسے اپنے طریق پر سوچنا چاہیے۔

خَلَقَ اللّٰهُ لِلْحُرُوْبِ رِجَالاً

وَرِجَالاً لِقَصْعَةٍ وَثَرِيْدِ

ہر کسے را بہر کارے ساختند

ردوقبول کے اسباب کا تجزیہ

کسی چیز کے ردوقبول میں جہاں بعض دوسرے اسباب کارفرما ہیں وہاں اعتماد کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے اور اعتماد میں انسانی سیرت کو بہت کچھ دخل ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ بسا اوقات متعدد آدمیوں کی درایت پر اعتماد نہیں کیا جاتا اور ایک شخص جس کی عادات سے ہم واقف ہیں ہمیں زیادہ یقین حاصل ہوتا ہے اسی طرح اگر ایک بڑا صادق القول شخص کسی ایسے ملک میں چلا جائے جہاں لوگوں کو اس کی صداقت کا علم نہ ہو اور وہ اُس کے اوصاف سے آشنا نہ ہوں تو وہاں اس کی روایت اور شہادت کو کوئی اہمیت نہیں دی جائے گی لیکن اگر اس کے ان اوصاف اور اس کی سیرت کے محاسن لوگوں کو معلوم ہوں تو پھر وہ کوئی قصہ یا واقعہ بیان کرے تو اس پر کوئی شبہ نہیں ہوگا اور اس کے جاننے والے خود اس کی خبر کو قبول کریں گے۔ علمِ رجال کی ایجاد محدثین نے اسی عقلی اور نفسیاتی اصول کی بنا پر کی تاکہ رجال کی سیرت کا علم ہو سکے اور

روایت پر اعتماد کیا جا سکے۔ ﴿فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝﴾ ❶
میں آنحضرت ﷺ نے بھی اسی اعتماد کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اگر میں غلط بیانی اور غلط گوئی کا عادی ہوتا تو آج سے چالیس برس پہلے بھی غلط بیانی سے کام لیتا۔

آنحضرت ﷺ کی سیرت قرآن میں

آنحضرت ﷺ کی سیرت ڈھکی چھپی چیز نہیں لیکن اس کا ذخیرہ زیادہ تر احادیث میں ہے منکرین حدیث ممکن ہے اس ذخیرہ پر اعتماد نہ کریں اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی سیرت قرآنِ عزیز سے تلاش کی جائے تاکہ ایک قرآن کا طالب علم سمجھ سکے کہ جس شخص کی سیرت اس طرح روشن ہے آیا اس کا قول، فعل، تقریر اور اجتہاد قابلِ اعتماد ہے یا نہیں، خلط بحث سے بچنے کے لیے روایت اور رواۃ کا میں نے یہاں بالکل تذکرہ نہیں کیا کیونکہ حجیت حدیث الگ بحث ہے اور طریقۂ روایت اور رجالِ حدیث ایک الگ بحث۔ اگر راوی ضعیف ہے اس کی روایت کے مشتبہ ہونے پر کوئی اعتراض نہیں۔ اگر راوی جھوٹا ہے تو اس کی روایت مسترد کر دی جائے گی لیکن حجیت حدیث پر اُن عوارض کا کوئی اثر نہیں ''حدیث بلحاظِ روایت'' کے موضوع پر کسی دوسری صحبت میں گزارشات کی جائیں گی حجیتِ حدیث کے مسئلہ میں عام اہل قرآن نے سند اور رجال کی بحث کو جس انداز سے گھسیٹنے کی کوشش کی ہے وہ دیانت داری پر مبنی نہیں ہے وہ صرف خلط بحث ہے۔

① ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ﴾ ❷

''رسول اور تمام اہل ایمان نے پیغمبر کی وحی کی تصدیق کی، یہ سب لوگ اللہ، رسول اور اس کی کتابوں اور فرشتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ ہم اس کے رسولوں میں تفریق نہیں کرتے۔''

اس آیت میں پیغمبر کو باقی تمام اہل ایمان کے ساتھ ایمان میں مساوی قرار دیا گیا ہے جس طرح عام لوگوں پر فرض ہے کہ پیغمبر کی وحی پر ایمان لائیں، پیغمبر پر بھی فرض ہے کہ وہ اپنی

❶ ۱۰/یونس:۱۶۔ ❷ ۲/البقرہ:۲۸۵۔

وحی پر یقین کرے اسی طرح خدا، رسول، ملائکہ اور آسمانی کتابوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ یہ آیت اس امر پہ شاہد ہے کہ پیغمبر اس امتحان میں کامیاب ہے اس لیے پیغمبر کے ارشادات پر بھی اسی طرح اعتماد ہونا چاہیے جس طرح علمۃ المسلمین کی باتوں پر منکرین حدیث عام مسلمانوں پر تواتر کی روایات میں اعتماد کرتے ہیں لیکن پیغمبر کو یہ حق دینے میں انہیں اعتراض ہے۔

② ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ ۙ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ ؕ﴾ ❶

''اللہ کے نام سے پڑھو جس نے پیدا کیا جس نے انسان کو لوتھڑے سے بنایا پڑھو تمہارا رب بہت برتر ہے جس نے قلم سے سکھایا اور انسان کو وہ چیز سکھائی جسے وہ نہیں جانتا تھا۔''

آیت مذکورہ میں آنحضرت ﷺ کو پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے جس کی آنحضرت ﷺ نے یقیناً تعمیل فرمائی پھر فرمایا: ﴿وَعَلَّمَکَ مَالَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ ؕ وَکَانَ فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکَ عَظِیْمًا ۝﴾ ❷ ''اللہ تعالیٰ نے تم کو وہ علم سکھائے جنہیں تم نہیں جانتے تھے اور تم پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہے۔''

اس آیت میں پیغمبر کے علم اور قرأت کا ذکر ہے اور ہر پڑھے لکھے آدمی پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کا یہ وصف قرآنِ عزیز کی شہادت سے ثابت ہے اس لیے ان کے ارشادات پر اعتماد ہونا چاہیے۔ انکارِ حدیث کے نظریہ کے پیش نظر پیغمبر کو اس اعتماد سے محروم کیا جاتا ہے اور یہ ظلم ہے۔

③ ﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ ۙ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّکَ بِمَجْنُوْنٍ ۚ وَاِنَّ لَکَ لَاَجْرًا غَیْرَ مَمْنُوْنٍ ۚ وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ۝﴾ ❸

''قلم اور ان کے لکھنے کی قسم، اللہ کے فضل سے تم مجنون نہیں۔ تمہارے لیے دائمی اجر ہے اور تم عظیم اخلاق کے مالک ہو۔''

آنحضرت ﷺ سے کہانت اور جنون ایسی مذموم عادات کی نفی کی گئی ہے اور آپ کے اعمال اور اطوارِ زندگی کو اس طرح سراہا گیا ہے اور انہیں یہ خصوصیت عطا فرمائی گئی ہے کہ

❶ ۹۶/العلق: ۱۔۵۔ ❷ ۴/النسآء: ۱۱۳۔ ❸ ۶۸/القلم: ۱۔۴۔

آپ کا اجر کبھی ختم نہ ہوگا۔ یہ صدقہ جاریہ ہے جو جناب کے انتقال کے بعد بھی جاری رہے گا یہ آنحضرت ﷺ کی زندگی کی بہت بڑی خوبی ہے کہ اس کی قبولیت اور دائمی اجر کا اعلان بذریعہ قرآن اسی دنیا میں کر دیا گیا۔ جس شخص کی پاکیزگی اور اخلاص عمل پر اسی دُنیا میں اعتماد فرمایا گیا ہے کیا اس کے ارشادات پر اعتماد نہ کیا جائے گا؟ اور انکارِ حدیث کی وجہ آنحضرت ﷺ کی ذات پر بے اعتمادی نہیں تو اور کیا ہے؟

﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾ ❶ کتنا بڑا اعزاز ہے جو آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی کو عطا فرمایا گیا جہاں تک تجربہ شاہد ہے ساری بے اعتمادیاں بدخلقی کی پیداوار ہیں لیکن آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی سے علی الاعلان بداخلاقی کی مدافعت فرمائی گئی ہے۔

نگاہِ ناز جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیٔ قسمت پر کیوں نہ ناز کرے

اور اعتماد کی بنیادیں مضبوط کر دی گئی ہیں اسی حقیقت کو ایک دوسری جگہ اور بھی واضح فرمایا گیا ہے۔ ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ﴾ ❷۔

''آپ کے مزاج گرامی کی نرمی خدا تعالیٰ کی رحمت ہے ورنہ اگر آپ تندخو اور سخت دل ہوتے تو یہ پروانوں کی صفیں جو مسجد نبوی میں مقامِ نبوت کی زینت ہو رہی ہیں سب تتر بتر ہو چکی ہوتیں۔''

اخلاق کی ان بلندیوں کے بعد اور سیرت رسول ﷺ کی اس سرفرازی کے باوصف جس کا اعتراف قرآنِ عزیز نے اس صراحت سے فرمایا ہے آنحضرت ﷺ کے اقوال و اعمال پر کوئی وجہ نہیں کہ بدگمانی کی جائے۔

④ ﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۙ﴾ ❸

❶ ٦٨/القلم: ٤۔ ❷ ٣/ آل عمران: ١٥٩۔ ❸ ٦٢/ الجمعة: ٢۔

"اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جس نے امیین میں سے ایک رسول برپا کیا جو ان پر اس کی آیات پڑھتا ہے ان کا تزکیہ کرتا ہے انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اور یہ لوگ اس کی بعثت سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔"

اس آیت پاک سے حسب ذیل امور ثابت ہوتے ہیں۔

(ا) آنحضرت ﷺ ایسے ماحول میں مبعوث فرمائے گئے جہاں تعلیم کا چرچا نہ تھا اور نہ ماحول ہی علمی تھا۔

(ب) اس کے باوجود آنحضرت ﷺ اللہ تعالیٰ کی آیات کی تلاوت فرماتے تھے۔

(ج) آنحضرت ﷺ کی تربیت کے اثر سے اس ناخواندہ اور غیر مہذب قوم کے ذہن صاف ہو گئے اور انہیں اخلاقی اور روحانی اور جسمانی پاکیزگی نصیب ہوئی اس جملہ میں آنحضرت ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم دونوں کی کامیابی کا اعلان ہے۔ پیغمبر کی قوتِ مؤثرہ کا اعلان ہے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے اخذ وتاثرِ واقعی کی تعریف فرمائی گئی ہے۔

(د) آنحضرت ﷺ انہیں کتابِ الٰہی کی تعلیم دیتے تھے وہ امی بھی تھے اور معلم بھی اور حکمت کی تعلیم بھی اس امی کی سیرت ہے ﷺ۔ ان اوصاف کی موجودگی میں آنحضرت ﷺ کے ارشادات کی جو اہمیت ہونی چاہیے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں، قرآن جس شخصیت کی تلاوت، تزکیہ اور تعلیم کی تعریف فرمادے اس پر شبہات کا اظہار ایمان کے منافی ہے۔ ﴿وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ﴾ [1]

⑤ ﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ ۝ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ﴾ [2]

"تمھیں میں سے تمہارے پاس رسول آیا تمھاری تکلیف اسے ناگوار ہے وہ تمہاری نصیحت کے خواہشمند ہیں اہل ایمان کے لیے ان کا دل بے حد نرم ہے اگر لوگ تمہاری اطاعت سے بے رخی برتیں تو ان سے کہہ دو میرے لیے اللہ کافی ہے اس کے سوا کوئی اللہ نہیں مجھے اس پر بھروسہ ہے اور وہ عرشِ عظیم کا محافظ ہے۔"

---

[1] ٢٦/ الشعرآء: ٢٢٧۔ [2] ٩/ التوبة: ١٢٨۔١٢٩۔

یہ سورۂ توبہ کی آخری آیات ہیں اور سورۂ توبہ شوال ۹ھ میں نازل ہوئی اس میں سورۂ نون کے بعض مجمل گوشوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے ﴿اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ﴾ کی وضاحت اور آنحضرت ﷺ کے رحمۃ للعالمین ہونے کا صراحۃً ذکر فرمایا ہے اور یہ رحمت و رافت اس وقت ظاہر اور نمایاں ہوئی جب مکہ فتح ہو چکا اور دشمن سرنگوں ہو چکے تھے اس قوت و عزت کے باوجود آپ کے اخلاق میں نہ جذبہ انتقام ہے اور نہ شدت ﷺ۔ اس حسنِ سلوک اور رفعتِ اخلاق کے باوجود آنحضرت ﷺ کے ارشادات قابلِ قبول نہیں تو معلوم نہیں ادارہ طلوعِ اسلام کون سا آلہ اعتماد کے لیے ایجاد کرے گا۔

⑥ ﴿وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَیْکَ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ وَعَلَّمَکَ مَالَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ ط وَکَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْکَ عَظِیْمًا﴾ [1]

''اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت اتاری اور وہ علوم سکھائے جو آپ نہیں جانتے تھے اور تم پر یہ اللہ کا بہت بڑا فضل تھا۔''

① آنحضرت ﷺ کے علوم، اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب وحکمت کی صورت میں نازل ہوئے۔

② اور یہ سب کچھ آنحضرت ﷺ کو لاعلمی کے بعد سکھایا گیا۔

③ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ اس میں پیغمبر کی ذات کو کوئی دخل نہیں۔ جب علم اور حکمت اللہ کی طرف سے اتاری گئی تو اس کی تمام تر ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر ہوگی پھر وہ حجت کیوں نہیں اور علومِ الٰہی سے ممتاز کیسے کی جائے۔ یہ ایک ایسی سند ہے جس کے رواۃ پر کوئی شبہ نہیں۔ قرآن حکیم اس کی صحت اور صداقت کا خود شاہد ہے، اس صداقت کے قبول سے محرومی واقعی محرومی ہے۔

⑦ ﴿مَاکَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّکَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْیًا اَوْمِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْیُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِهٖ مَایَشَآءُ ط اِنَّهٗ عَلِیٌّ حَکِیْمٌ﴾ [2]

اللہ تعالیٰ جب کسی سے کلام کرتا ہے تو اس کی تین صورتیں ہیں (۱) فرشتہ رسول کی شکل میں آئے (۲) غیبی آواز آئے (۳) یا بذریعہ الہام اسے اطلاع دی جائے۔

---

[1] ٤/النسآء: ١١٣۔ [2] ٤٢/الشوریٰ: ٥١۔

﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ 1

''ہم نے آپ کی طرف بھی اسی طرح اپنا امر وحی کیا۔''

﴿وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ﴾ 2

''آنحضرت ﷺ کسی حالت میں ہوں، قرآن پڑھیں یا کوئی اور کام کریں مگر اللہ تعالیٰ اس میں شاہد ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے کوئی ذرہ پوشیدہ نہیں اور نہ ہی کوئی بڑی یا چھوٹی چیز اس کی نگاہ سے مخفی ہے۔''

پہلی آیت میں آنحضرت ﷺ کے علوم اور ان کی تحصیل کی راہوں کا تذکرہ فرمایا اور دوسری آیت میں آنحضرت ﷺ کے تمام حالات کی ذمہ داری خود قبول فرمائی اور فرمایا جو تم کرتے یا کہتے ہو وہ میری نگاہوں میں ہے اور جب آسمان اور زمین کا کوئی ذرہ اور کوئی چھوٹی بڑی چیز ہم سے پوشیدہ نہیں تو پیغمبر کا قول و فعل اور دیگر امور ہم سے کیونکر چھپ سکتے ہیں؟

سورۂ عبس میں ابن ام مکتوم کے واقعہ میں اسی بے توجہی پر کس حکیمانہ انداز سے آنحضرت ﷺ کے طریق عمل کی اصلاح فرمائی ہے۔ 3 اس سے واضح ہے کہ آنحضرت ﷺ کے احوال پر خطیرۃ القدس کی توجہ کس قدر مبذول تھی۔ اس ذمہ داری اور احترام کے بعد بھی آنحضرت ﷺ کے ارشادات اور اعمال گرامی کو احتجاج کا مقام حاصل نہیں ہوتا تو فرمایا جائے کہ حجیت کے لیے اور کونسی سند ہونی چاہیے۔ جس کی سیرت اتنی پاک، جس کا علم اتنا محفوظ ہو اس کے اقوال کیونکر مشتبہ ہوں گے؟ ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰىؕ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾ 4 میں بظاہر نطق ہی کو وحی قرار دیا گیا ہے اور آیت نمبر 4 میں آنحضرت ﷺ کے تمام حالات کا

---

1 ٤٢/الشوریٰ: ٥٢۔ 2 ١٠/یونس: ٦١۔

3 الترمذی: کتاب تفسیر القرآن' باب ومن سورۃ عبس رقم ٣٣٣١۔ 4 ٥٣/ النجم: ٣۔٤۔

ذمہ لے لیا گیا ہے۔ اس سے آنحضرت ﷺ کے تمام علوم کی حفاظت بالکل واضح ہے۔

⑧ ﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰىٓ ۙ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۭ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰىٓ ۙ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۭ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۙ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ۭ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ۭ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۙ وَهُوَ يَخْشٰى ۙ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۚ﴾ [1]

"ایک نابینا آیا آپ نے اس سے رنج آمیز بے توجہی فرمائی۔ آپ ﷺ کیا جانتے ہیں وہ پاکباز ہو، نصیحت سے اسے فائدہ ہو، غفلت پیشہ لوگوں کی طرف آپ زیادہ توجہ کرتے ہیں۔ کیا معلوم اس میں تزکیہ کی روح ہے بھی یا نہیں اور جو لوگ ہمہ تن شوق ہو کر آئیں اور ان کا دل خشیۃ الٰہی سے معمور ہو آپ اس سے بے نیازی برتتے ہیں۔"

ان آیات میں آنحضرت ﷺ کے معمولات پر حکیمانہ تنقید فرمائی گئی ہے بشری تقاضوں کی وجہ سے جہاں ایسا کوئی واقعہ رونما ہوا جو ملاء اعلیٰ کے مصالح کیخلاف تھا وہیں آنحضرت ﷺ کو توجہ دلادی گئی تا کہ پیغمبر کی صوابدید ملاء اعلیٰ کے منشا کے موافق ہو جائے۔

کتنا معمولی واقعہ ہے کہ آنحضرت ﷺ بعض قریشی رؤسا سے گفتگو فرما رہے تھے آنحضرت ﷺ کی دلی آرزو تھی کہ یہ لوگ جہنم کی آگ سے بچیں اچانک عبداللہ رضی اللہ عنہ بن امِ مکتوم نے اپنی معتاد بے تکلفی کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی توجہ کو اپنی طرف پھیرنا چاہا آداب مجلس کا تقاضا تھا کہ جب تک پہلی گفتگو ختم نہ ہو جائے دوسری طرف توجہ نہ فرمائی جائے۔ آنحضرت ﷺ نے اسی قاعدہ کے مطابق عمل کیا۔ انسانی آداب اور آئینِ مجلس کے لحاظ سے اس میں کوئی غلطی نہ تھی مگر یہ اصول پسندی عبداللہ بن ام مکتوم ایسے مخلص کی دل شکنی کا موجب ہوئی جسے آسمان پر بھی ناپسند فرمایا گیا اور ارشاد ہوا کہ ہدایت کی امید پر ان لوگوں کو نظر انداز نہ فرمایا جائے جن پر اللہ تعالیٰ کی نوازش ہو چکی ہے۔ اور ان کے دل خشیت الٰہی سے معمور ہو چکے ہیں [2] آنحضرت ﷺ کے یومیہ معمولات پر یہ کتنا بڑا احتساب ہے، حالانکہ ایسے واقعات ایک مبلغ کی زندگی میں آئے دن پیش آتے ہیں اور اسے حفظِ مراتب اور آدابِ مجلس

---

[1] ۸۰/ عبس: ۱-۱۰۔ [2] الترمذی: کتاب تفسیر القرآن، باب ومن سورة عبس، رقم ۳۳۳۱۔

کا یومیہ بار ہا لحاظ رکھنا ہوتا ہے تاکہ اس کی زندگی معاشرہ میں اجنبی اور عجوبہ تصور نہ کی جائے لیکن یہاں بھی آنحضرت ﷺ کو آزاد نہیں چھوڑا گیا۔ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم.

ایک سیاسی نوعیّت کا واقعہ

﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ أَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ ۭ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ڰ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْأٰخِرَةَ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَا أَخَذْتُمْ فِيْهِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝﴾ [1]

''اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر پیغمبر کے پاس قیدی آ جائیں تو انہیں موت کے گھاٹ اتار دینا چاہیے یہاں کوئی دنیوی مفاد پیش نظر رکھنا مناسب نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے منشا کے مطابق صرف آخرت کی بہتری مطلوب ہونی چاہیے اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے معاملہ پہلے سے طے نہ ہو چکا ہوتا تو تمہیں بڑی سخت اذیت اور تکلیف سے سابقہ پیش آ جاتا۔''

بدر کی جنگ میں مسلمانوں کے ہاتھ قیدی آئے۔ آنحضرت ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کے بعد ان سے فدیہ لے کر انہیں چھوڑنے کا فیصلہ فرما دیا، مجلسِ شوریٰ کی اکثریت اسی فیصلے کے حق میں تھی خود قرآن کا جنگی قانون اس فیصلہ کی تائید میں تھا۔ ﴿إِمَّا مَنًّا ۢ بَعْدُ وَإِمَّا فِدَآءً﴾ [2] دونوں اختیار موجود تھے لیکن بدر کے قیدیوں کے متعلق مصلحت خداوندی کا تقاضا اس اختیار کے خلاف تھا اور ائمۃ الکفر کو اس رخصت کا فائدہ دینا ناپسند تھا اس لیے مجلسِ شوریٰ کے اس جمہوری فیصلے کو ناپسند کیا گیا لیکن مسترد نہیں فرمایا تاکہ آنحضرت ﷺ اور ان کے رفقا محتاط رہیں، جنگی معاملات میں ایسے فیصلے روزمرہ کا معمول ہے اور برسرِ پیکار قومیں اس قسم کے فیصلے عموماً اپنی صوابدید سے کیا کرتی ہیں لیکن یہ فیصلہ باوجودیکہ آنحضرت ﷺ نے بالکل جمہوری طریق پر کیا تاہم ناپسند فرمایا گیا [3] اس سے ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ اور آپ کے رفقا عام متحارب قوموں کی طرح آزاد نہیں چھوڑے گئے۔ ﴿لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ ۝﴾ [4]

---

[1] ۸/الانفال: ۶۷-۶۸۔ [2] ۴۷/محمد: ۴۔

[3] ترمذی: کتاب تفسیر القرآن، باب من سورۃ الانفال، رقم ۳۰۸۴۔ [4] ۲۱/الانبیآء: ۲۳۔

تیسرا واقعہ

﴿اِسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ اَوۡ لَا تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ ؕ اِنۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ سَبۡعِيۡنَ مَرَّةً فَلَنۡ يَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَهُمۡ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ كَفَرُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِيۡنَ۠﴾ [1]

ان کے لیے استغفار بے سود ہے آپ ستر دفعہ بھی ان کے لیے استغفار فرمائیں ان کو بخشا نہیں جائے گا کیوں کہ یہ خدا اور رسول کے منکر ہیں اور ایسے معصیت کیش لوگوں کے لیے بخشش کی راہیں نہیں کھل سکتیں۔"

﴿وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمۡ عَلٰى قَبۡرِهٖ ؕ اِنَّهُمۡ كَفَرُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَمَاتُوۡا وَهُمۡ فٰسِقُوۡنَ﴾ [2]

"اگر یہ منافق مرجائیں تو ان پر نماز مت پڑھو اور نہ ان کی قبر پر ٹھہرو یہ اللہ اور اس کے رسول کے منکر ہیں اور اسی فسق و فجور پر ان کی موت واقع ہوئی ہے۔"

کسی کی موت پر دعا کرنا یا اس کی قبر پر جانا معاشرتی معاملات میں سے ایک معمول ہے آنحضرت ﷺ نے اسی معمول کے مطابق بعض منافقین پر نوازش فرمائی اس پر ارشاد ہوا کہ فاسق مزاج اور معصیت پیشہ لوگوں کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہونا چاہیے شہری زندگی میں کسی کے جنازے پر جانا یا تعزیت کرنا معمولی بات ہے بلکہ تبلیغی مصالح کے لیے ایک حد تک جاذب بھی۔ لیکن آنحضرت ﷺ فداہ ابی وامی کو منافقین کی حد تک اس اخلاقی رعایت سے بھی روک دیا گیا اس سے معلوم ہے کہ آنحضرت ﷺ کے یومیہ معمولات پر کس قدر نظر رکھی گئی تھی۔ [3]

چوتھا واقعہ

ڈسپلن اور نظم فوجی زندگی کی روح ہے لیکن اس کا تمام تر تعلق محکمانہ ہوتا ہے ایسے معاملات میں خارجی مداخلت نظم کے منافی سمجھی جاتی ہے غزوۂ تبوک سے کچھ لوگ پیچھے رہ گئے ان میں اکثر منافق تھے ان کو یقین تھا کہ آنحضرت ﷺ اس جنگ سے بخیرت واپس نہیں

---

[1] ۹/التوبہ: ۸۰۔ [2] ۹/التوبہ: ۸۴۔ [3] بخاری: کتاب التفسیر، باب قولہ استغفرلهم...... رقم ۴۶۷۰؛ الترمذی، فی ابواب تفسیر القرآن، باب ومن سورۃ التوبۃ، رقم ۳۰۹۸۔

لوٹیں گے کیونکہ ایک مضبوط اور باقاعدہ جنگی قوت سے تصادم ہوگا اور ان کے خیال میں آنحضرت ﷺ کے لشکر کی جنگی استعداد ان سے ٹکر لینے کے قابل نہ تھی۔ آنحضرت ﷺ وہاں سے بخیریت واپس آئے اور منافقین کے خیالات غلط ثابت ہوئے تو منافقین نے اپنی غیر حاضری کے متعلق غلط عذر تراشنے شروع کیے قسمیں کھائیں اور آنحضرت ﷺ کو یقین دلایا کہ وہ اس غیر حاضری میں واقعی معذور تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کے عذر قبول فرما کر انہیں معافی دے دی [1] لیکن اللہ تعالیٰ نے اس قدر جلدی معافی دینا پسند نہیں فرمایا۔

﴿عَفَا اللّٰهُ عَنْکَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْکٰذِبِیْنَ۝﴾ [2]

''اللہ تعالیٰ نے تمہیں معاف فرما دیا تم نے اس قدر جلدی انہیں کیوں اجازت دیدی۔ سچے اور جھوٹے کا نکھرنا ضروری تھا۔''

یہ چار واقعات ہیں جن کا زندگی کے مختلف پہلوؤں سے تعلق ہے اور بہت حد تک یہ واقعات دنیوی امور سے متعلق ہیں جب ان کے متعلق قطعی اور حتمی ہدایات دی گئی ہیں تو خالص دینی اور تعبدی امور میں آنحضرت ﷺ کے معمولات پر کیونکر نظر نہ ہوگی۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے اقوال وافعال حجت ہیں محتاط سیرت کے بعد جس کا اظہار قرآن عزیز میں فرمایا گیا ہے۔ آنحضرت ﷺ کے ارشادات کی حیثیت بہت نمایاں ہوجاتی ہے۔

⑨ ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ؗ﴾ [3]

''محمد ﷺ اللہ کے پیامبر ہیں اور آپ کے ساتھی حق کے منکروں کے لیے بے حد سخت گیر ہیں ان کے باہمی تعلقات رحم وکرم پر مبنی ہیں وہ اللہ کے فضل اور رضامندی کی تلاش کے لیے ہمیشہ رکوع اور سجود میں مشغول رہتے ہیں ان کے ان اچھے فضائل کا ذکر تورات وانجیل میں بھی پایا گیا ہے۔''

---

[1] الترمذی' کتاب التفسیر، باب ومن سورة التوبة رقم ۳۱۰۲؛ بخاری' کتاب التفسیر' باب قوله و علی الثلاثة الذین خلفو' ۴۶۷۷؛ النسائی' کتاب المساجد، باب الرخصة فی الجلوس فیه رقم ۷۳۲۔

[2] ۹/التوبه: ۴۳۔ [3] ۴۸/الفتح: ۲۹۔

ذاتی نام کے ساتھ وصف رسالت کے تذکرہ سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کا مقام بلحاظ محمد وصفِ رسول سے مختلف ہے رسالت کے تقاضوں کا یہ اثر ہے کہ حضرت کے ماننے والوں میں دو متضاد قوتیں اس طرح سمودی گئی ہیں کہ کوئی چیز بھی بے محل اور بے وقت استعمال نہیں ہونے پاتی بلکہ سختی اور شدت جب بھی استعمال ہوئی ہے منکرین حق اور سچائی کے دشمنوں کے خلاف استعمال ہوئی۔ اور رافت و رحمت کا ظہور جب بھی ہوا اس نے حق پرست اور اصحاب دیانت کو تلاش کر لیا جس کالج کے طلبہ میں احتیاط کا یہ عالم ہے کہ کوئی جذبہ اور فطرت کا کوئی تقاضا بے محل استعمال نہیں ہونے پاتا اس کالج کے پرنسپل اور معلم کے متعلق سوچیے کہ اس کا مقام کیا ہوگا۔

قرآنِ حکیم نے رقتِ قلب اور غضب و شدت کے دونوں حالات کا موازنہ فرمایا ہے ان غیر معمولی حالات میں اگر اعتدال قائم ہے اور مزاج نے کوئی غلط فیصلہ نہیں کیا تو نارمل اور معتدل حالات کے متعلق تو بحث کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ پھر جس کی تعلیم نے غیر رسول اور غیر معصوم انسانوں میں یہ اعتدال پیدا کر دیا۔ وہ معلم جب بوصفِ رسالت ہوگا تو عصمت اس کی زینت ہوگی غور فرمایئے کہ بے اعتدالی کے لیے یہاں گزر کی کوئی گنجائش ہوگی؟ ایسے مقدس انسان کے دینی ارشادات کی شرعی حیثیت پر بحث کرنا بھلا معلوم نہیں ہوتا۔ ہر مقام پر چوروں کی تلاش اور چوری کی فکر شرافت کا تقاضا نہیں۔ جس کے تقدس کی منادی چار دانگ عالم میں تورات وانجیل نے کردی ہو آج کون ہے جو اس کی طرف تنقید کی نگاہ سے دیکھے؟ بلحاظِ رسول آنحضرت ﷺ کے مقام کی وضاحت اس آیت میں بصراحت موجود ہے معترضین کو سوچنا چاہیے کہ ان کا موقف کیا ہے۔ ﴿وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ﴾ [1]

﴿الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ أَضَلَّ أَعْمَالَهُمْ ○ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَآمَنُوا بِمَا نُزِّلَ عَلَى مُحَمَّدٍ وَهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَأَصْلَحَ بَالَهُمْ ○﴾ [2]

"حق وصداقت کے منکر اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکتے ہیں اس لیے ان کے اعمال برباد ہو

---

[1] ٢٦/الشعراء: ٢٢٧۔ [2] ٤٧/محمد: ١،٢۔

گئے اور سچائی پر یقین کرنے والے جن کی عملی زندگی درست ہے اور وہ آنحضرت ﷺ کی وحی پر یقین رکھتے ہیں ان کی غلطیاں معاف ہوں گی اور ان کے حالات درست ہوں گے۔''

سورۂ محمد کے آغاز سے ہی اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا ذکر فرمایا۔ جہاد، جنگی قیدیوں کا معاملہ، منافقین کی چالاکیاں اور جہاد سے گریز وغیرہ احوال سے ذکر فرما کر ارشاد ہوا ﴿فَاَوْلٰى لَهُمْ ۝ طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ﴾ [1] ان کے لیے آنحضرت ﷺ کی اطاعت اور دستور کی گفتگو کرنا صحیح راہِ عمل ہے ورنہ یہ لوگ خدا کی لعنت میں گرفتار ہوں گے سورۃ کا خاتمہ بھی اسی نصیحت پر فرمایا۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ ۝﴾ [2]

''اے صداقت کے پرستارو! اللہ کی اطاعت اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو برباد نہ کرو۔''

یعنی رسول کی اطاعت سے انحراف بھی عمل کو اسی طرح برباد کر دیتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اسے تباہ کر دیتی ہے یہ رسول کے موقف کی کس قدر کھلی وضاحت ہوئی ہے؟

﴿وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا وَّعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ۝ فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا ۝ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۚ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۝ رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ﴾ [3]

''بہت سی بستیوں نے اللہ اور اس کے فرستادوں کے احکام سے روگردانی کی ہم نے ان سے سخت محاسبہ کیا اور بے مثل عذاب میں انہیں گرفتار کیا، انہوں نے اپنے کیے کا وبال برداشت کیا اور بالآخر انہیں بے حد خسارہ ہوا اللہ نے سخت ترین عذاب ان پر مسلط فرمایا اے دانشمند ایماندارو! اللہ سے ڈرو اللہ نے تمہاری طرف اپنا ذکر بصورتِ

---

[1] ٤٧/محمد: ٢٠، ٢١۔ [2] ٤٧/محمد: ٣٣۔ [3] ٦٥/الطلاق: ٨، ١١۔

رسول نازل فرمایا جو تم پر اس کی آیات تلاوت کرتا ہے۔" الخ

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول کے احکام کی نافرمانی کو بہت سی بستیوں کی تباہی کا سبب ٹھہرایا ہے اور ان کی اہمیت کو اوامر الٰہی کے مساوی قرار دیا ہے۔ حساب کی شدت، عذاب وبال اور بالآخر خسارہ کو اسی عصیان کا نتیجہ قرار دیا ہے اور تمام ایماندار اور عقلمند دنیا کو توجہ دلائی ہے کہ خدا کا ذکر رسول کی صورت میں نازل ہوا ہے تاکہ وہ اہل ایمان کو گمراہی کی ظلمتوں سے نکال کر ایمان کی روشنی سے روشناس کرے۔

اس طرح پوری سورۂ طلاق اس امر کی شہادت دیتی ہے کہ رسول کے فرامین واجب الاطاعت اور واجب التعمیل ہیں۔ فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَارِ۔

الاعتصام: ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۰



سیرۃ نبی ﷺ پر ایک بہترین اور جامع کتاب

وما أرسلناك إلا رحمة للعالمين

تالیف

قاضی محمد سلیمان سلمان منصورپوری

مکتبہ اسلامیہ



شہرۂ آفاق کتاب

الرحیق المختوم

کے نامور مصنف کی ایک اور شاہکار تصنیف

قادیانیت

اپنے آئینے میں

مولانا صفی الرحمن مبارکپوری



مکتبہ اسلامیہ

أطيعوا الله والرسول

رواه مسلم



حجیتِ حدیث